تحقیق میں ندرت اور تنوع کا حامل علمی، تحقیقی اور اصلاحی مجلہ

سہ ماہی الصدیق صوابی

بدعاء
پیر طریقت شیخ الحدیث
مولانا شیر اسلم خان قدس سرہ

جلد ۱، شمارہ ۳/رجب المرجب تا رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ/اپریل تا جون ۲۰۱۷ء

زرتعاون.....فی شمارہ: ۸۰ روپے

زیر سرپرستی
حضرت مولانا عبدالحئی بادشاہ صاحب
حضرت مولانا عبدالمحئی بادشاہ صاحب
مدیر مسئول
حضرت مولانا عبدالروف بادشاہ
مدیر
منفعت احمد
معاون مدیر
محمد اسلام حقانی
منتظم
مولانا عبدالجلیل بادشاہ
مجلس ادارت
مولانا مفتی سجاد الحجابی مولانا محمد کامران ہوتی
ڈاکٹر حافظ محمد بادشاہ مولانا ڈاکٹر جنید اکبر
مفتی ثناء اللہ
قانونی مشیر
مولانا محمد وجیہ اللہ ایڈوکیٹ (اسلام آباد)

دفتر سہ ماہی الصدیق
معہد الصدیق للدراسات الاسلامیۃ
بام خیل، صوابی، خیبر پختونخوا
alsiddiq2016@gmail.com
0313-9803280/0345-9506009

فہرست مضامین

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	مولانا سید نفیس الحسینی رحمہ اللہ	۲
امت مسلمہ کی حالت زار	مدیر	۳
فہم قرآن کے مختلف مناہج میں منہج اعتدال	مولانا عبدالحمید نعمانی	۹
تفسیر بیضاوی پر ایک نظر	مولانا محمد کامران ہوتی	۱۷
فن خطابت اور علمی جستجو	مولانا سجاد الحجابی	۲۴
تقسیم مقاصد شریعت	مولانا مدثر جمال تونسوی	۳۱
خواتین کا مقام مغرب اور متجددین کی نظر میں	ڈاکٹر سید خالد جامعی	۴۰
اسلام کے عائلی قوانین پر عمل ضروری کیوں؟	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۵۴
دینی مدارس کا عصری نظام تعلیم سے اشتراک	مولانا محمد طفیل قاسمی	۵۹
زمانہ جاہلیت کی شاعری کا عمومی جائزہ	پروفیسر محمد انس حسان	۷۱
سود ایک روحانی اور مادی وباء	مولانا عبدالروف بادشاہ	۸۳
شرح مشکل الآثار ایک تعارف	مولانا جواد علی شاہ حقانی	۸۸
یوم پیدائش محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحقیق	مولانا علی عمران	۹۳
ادائیگی حقوق کی فکر کیجئے!	مولانا سید حبیب اللہ حقانی	۱۰۰
بے سہاروں کی مدد	مولانا محمد اسلام حقانی	۱۰۳
استشراق آغاز وارتقاء، مقاصد وطریق کار	محترمہ آمنہ ارشد	۱۱۳
رمضان المبارک تقویٰ کے حصول کا ذریعہ	مولانا عبدالجلیل بادشاہ	۱۱۸
معہد الصدیق کے جلسہ دستار بندی	پروفیسر ظاہر گل	۱۲۲
امتحانات میں نقل کرنا ایک شرعی وقانونی جرم	دارالافتاء	۱۲۵
احوال وکوائف	مولانا محمد اسماعیل حقانی	۱۲۸
کتاب شناسی	مبصر کے قلم سے	۱۳۰

ادارے کا مضمون نگار حضرات کے تمام آراء وافکار سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اے رسولِ امیں، خاتم المرسلیں! تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں
ہے عقیدہ یہ اپنا بصدق و یقیں ، تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں
دستِ قدرت نے ایسا بنایا تجھے ، جملہ اوصاف سے خود سجایا تجھے
اے اَزل کے حسیں، اے اَبد کے حسیں ! تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں
بزمِ کونین پہلے سجائی گئی ، پھر تری ذات منظر پہ لائی گئی
سید الاوّلیں ، سید الآخریں ! تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں
تیرے انداز میں وسعتیں فرش کی ، تیری پرواز میں رفعتیں عرش کی
تیرے انفاس میں خُلد کی یاسمیں ، تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں
مصطفیٰ مجتبیٰ ، تیری مدح و ثنا ، میرے بس میں نہیں ، دسترس میں نہیں
دل کو ہمت نہیں ، لب کو یارا نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں
چار یاروں کی شانِ جلی ہے بھلی ، ہیں یہ صدیقؓ ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ
شاہدِ عدل ہیں یہ ترے جانشیں ، تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں
اے سراپا نفیس اَنفسِ دو جہاں ، سرورِ دلبراں دلبرِ عاشقاں
ڈھونڈتی ہے تجھے میری جانِ حزیں ،تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں

حرفِ صدق

امت مسلمہ کی حالت زار: پس چہ بائد کرد

اس وقت صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہم مسلمان جن حالات سے گذر رہے ہیں، اس کی سنگینی کا احساس ہر خاص وعام کو ہے ہماری سیاسی قوت مدتوں سے ٹوٹ چکی ہے، اجتماعیت کا شیرازہ منتشر ہوچکی ہے، گروہی عصبیت ہماری رگ جان میں پیوست ہوگئی ہے، گزشتہ دوصدیوں کی تاریخ ذلتوں، نکبتوں اور المناک مظالم سے بھری ہوئی ہے، ایک زخم پر مرہم نہیں رکھا جاتا کہ دوسرا زخم لگا دیا جاتا ہے، کمزوری اور ذلت وبے چارگی روز افزوں ہے، مسلمان صرف دوسروں کے رحم وکرم پر ہیں، کوئی راہ حالات کے بہتر ہونے کی نظر نہیں آتی، مسلمان اپنی مظلومیت پر ماتم کرتے ہیں، اس سے فارغ ہوتے ہیں تو احتجاج کر لیتے ہیں، دیوانے چیخ لیتے ہیں، فرزانے فلسفیانہ غور وفکر میں مشغول ہوکر دل بہلا لیتے ہیں، اس سے مایوس ہوتے ہیں تو قیادت نہ ہونے کا شکوہ کر لیتے ہیں یا دشمنوں پر تبرا پڑھ لیتے ہیں، مگر حق یہ ہے کہ حالات کے بدلنے کی کسی کو کوئی راست تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جس قوم کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے، وہ ان کی کرتوتوں کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لئے جو حالات پیش آرہے ہیں، ان میں سب سے بڑا دخل ہماری کوتاہیوں، غفلتوں، بداعمالیوں اور بدکرداریوں کا ہے، بیماریاں بہت سی ہیں، جن کے علاج کی ہمیں ضرورت ہے، بظاہر ان بیماریوں کی سنگینی کا ہمیں احساس نہیں اور موجودہ حالات سے ان کا کوئی تعلق ہماری سمجھ میں نہیں آتا، لیکن یہ بات سمجھنے کی ہے کہ گناہوں کا ایک اثر ہوتا ہے، جو ظاہر ہوکر ہی رہتا ہے، اور جب کوتاہی اور غفلت شعاری کسی ایسی امت کی طرف سے ہو، جسے انسانیت کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہو، تو مسئلہ اور بھی سنجیدہ ہوجاتا ہے، اور پھر سستی اور غفلت کے نتیجہ میں اللہ تعالی اس طرح کے حالات پیدا کرتا ہے، تاکہ وہ امت دوبارہ اس کی طرف پلٹ کر آئے اور اپنی مجرمانہ غفلت کا تدارک کرے۔

اس لئے اس حقیقت کا ادراک نہایت ضروری ہے کہ امت مسلمہ کا تعلق خدا تعالی سے کمزور ہوچکا ہے، اور خدا تعالی کا یہ تعلق ہی اس کا معاون ومحافظ ہوتا رہا ہے، اب جب ایسے محافظ سے ہی ہم محروم ہوجائیں تو پھر شکست وریخت کا شکوہ کیوں کر؟ اس لئے ضروری ہے کہ امت اللہ تعالی سے اپنا تعلق استوار کرے، اور اپنے روگوں کا قرآن وسنت کی روشنی میں علاج کرے، جب تک ان بیماریوں کو دور نہ کیا جائے گا، اور ان کا علاج نہ ہوگا، اس وقت تک حالات کے سدھرنے کا بھی کوئی امکان نہیں، یہاں صرف چند موٹی موٹی بیماریوں کا ذکر کیا جانا ضروری ہے، جن میں ہماری اکثریت مبتلا ہے، اور جن کا موجودہ حالات کے پیدا ہونے میں بہت بڑا

کردار ہے، یہ وہ بیماریاں ہیں جن کو دور کرنے کی شدید ضرورت ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں دیگر چیزوں پر توجہ نہیں دینی ہے، وہ چیزیں بھی ضروری ہیں اور یہ بھی، دونوں میں توازن ہوگا تب ہی ہماری کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوں گی۔

پہلی بیماری جو ہم کو لاحق ہے وہ ہے اتحاد کا فقدان، آج قوم اور ملت کو سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اتحاد اور باہمی تعاون و مدد کا مزاج ہے، مگر جان لیجیے کہ ہمارا جو اخلاقی حالت ہے، اس سے سب سے پہلے قوم کا اتحاد پارہ پارہ ہوتا ہے، اس لیے کہ اتحاد کی پہلی شرط ایمان دارانہ حق شناسی، دوسروں کی برتری کا شریفانہ اعتراف اور ایثار جیسی صفات ہیں، اگر خواص میں حق شناسی نہ ہو، ایمانداری کے ساتھ دوسروں کے مرتبے اور فوقیت کا اعتراف نہ ہو، اور کم از کم درجے کا بھی ایثار نہ ہو، اور ان صفات کی جگہ عالم یہ ہو کہ ہر شخص اپنی ذات کا اسیر اور خود کی عبادت اور پرستش میں مصروف ہو تو یقینا نفسانفسی کا عالم ہی قائم نظر آئے گا، اس بیماری کی شدت کے باوجود اپنی صفوں میں اتحاد کی توقع کرنا ایسا ہی ہے کہ آپ کسی بیمار و لاغر سے توقع کریں کہ وہ کسی بڑے پہلوان کو چت کر دے۔

دوسری بیماری جو ہم میں اکثریت کو درپیش ہے وہ ہے مادیت پرستی، آج ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہر شخص دنیا کی دولت کے پیچھے پڑا ہے، ہر ایک کی نگاہ میں نقد منافع کی اہمیت ہے، جن اعمال کی بنیاد پر کل اجر ملے گا، انہیں بالکل بے حیثیت سمجھ لیا گیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ دنیا کمانے کی فکر میں ہے، وہ اپنی موجودہ پوزیشن پر قانع نہیں، بلکہ جو کچھ اللہ تعالی نے اسے دے رکھا ہے، وہ اسے گویا کم تر سمجھتا ہے اور ہمہ وقت اس میں اضافہ کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے، دولت کمانا یا اس میں اضافہ کی کوشش کرنا کوئی معیوب بات نہیں، لیکن اس کے کچھ حدود ہیں، انہی حدود میں رہ کر انسان حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ جیسا غنی اور مالدار بھی بن سکتا ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ اس مادی نقطۂ نظر نے تمام حدود کو پھلانگنا سکھا دیا ہے، اب ہر شخص اس فکر میں ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ مال دار ہو جائے، ایک ریس ہے جس میں سب بھاگے جا رہے ہیں، نہ حلال حرام کی فکر ہے اور نہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال، یہی وہ مرض ہے جس نے مسلمانوں اور کافروں کے درمیان حد فاصل کو ختم کر دیا ہے، مسلمانوں کا یہ امتیاز تھا کہ وہ معاد کے لئے جیتے تھے اور معاد کے لئے ہی سب کام کرتے تھے، فکر معاش، فکر معاد کے تابع ہوا کرتا تھا، مگر اب انہوں نے اپنے اس امتیاز کو ختم کر کے خود کو اسی رنگ میں رنگ لیا ہے، جو غیر مسلموں کا رنگ ہے، ضرورت ہے کہ ہم اس بیماری سے باہر آئیں، اور وقتی نفع سے اوپر اٹھ کر دائمی اور اخروی فائدہ پر نظر رکھیں۔

تیسری بیماری آخرت فراموشی اور خود احتسابی کا فقدان ہے، یہ آخرت فراموشی اور خود احتسابی کا فقدان ہی مادیت پرستی کا نتیجہ ہے، آج ہم میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ کئی کئی ہفتے گذر جاتے ہیں، اور ہمیں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن ہمیں خدا کے حضور پہنچنا ہے، قبر کے مراحل سے گذرنا ہے اور آخرت کے سخت ترین دن سے نمٹنا ہے، یوں تو ضروری ہے کہ ہمہ وقت آخرت کا استحضار رہے؛ لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تو لازمی ہے کہ ہم ہر روز کسی خاص وقت بالخصوص رات کو بستر پر لیٹے ہوئے، خدا تعالی کے سامنے جواب دہی کے بارے میں سوچیں، اور ذرا تصور کریں کہ اگر وہ ہم سے حساب لینے لگا، تو ہمارا کیا بنے گا؟ روزانہ کے اپنے اعمال کا جائزہ لیں، کہ کتنے اچھے اعمال کئے اور کتنے گناہ کئے، اور سونے سے پہلے استغفار ضرور کریں، اور رو رو کر خدا کے سامنے اپنے افعال و کردار بد سے رجوع کریں۔

چوتھی بیماری جو ہم سب کو لاحق ہیں وہ ہے خواہشات کی بندگی اور نفس کی پیروی، وہ لوگ جو آخرت کو بھی یاد رکھتے ہیں اور کبھی کبھی اللہ تعالی کے سامنے جواب دہی کا احساس بھی ان میں پیدا ہوتا ہے، اور وہ گناہوں سے بچنے اور نیکی کرنے کی بھی فکر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالی کی نافرمانی نہ ہو، لیکن وہ اپنی خواہش اور نفس کے آگے شکست کھا جاتے ہیں، اذان کی آواز سن کر دل میں نماز پڑھنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، لیکن محض اس وجہ سے مسجد نہیں پہنچ پاتے کہ ان کی خواہش پر بار ہوتا ہے اور ان کا ''نفس'' نماز پڑھنے پر تیار نہیں ہوتا، اسی طرح کبھی ان کے دل میں گناہ کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، اور اللہ تعالی کا خوف بھی سامنے آتا ہے اور گناہ سے روکتا ہے، لیکن پھر نفس اور ''خواہش'' کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ گناہ کر بیٹھتے ہیں، اس طرح کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اپنی خواہش کو اللہ کے احکام پر ترجیح دیتے ہیں اور اسلامی احکام کے آگے خواہش کے ہاتھوں شکست کھا جاتے ہیں، جس طرح انسان اپنے معبود کی بات مانتا اور اس کی اطاعت کرتا ہے، اسی طرح بعض لوگ اپنی خواہش کے پیچھے چلتے ہیں، جیسے ان کی خواہش ہی ان کے لئے معبود ہو گویا ''نفس'' کا غلام ہو، جو شخص بھی اپنے ''نفس'' کا غلام ہو، وہ دنیا میں بھی ترقی نہیں کر سکتا۔

ایک طالب علم اگر اس وجہ سے کہ پڑھنے کو جی نہیں کرتا تعلیم میں سستی کرے، یا ایک تاجر اس وجہ سے کہ دوکان کھولنے پر دل آمادہ نہیں، اپنی تجارت میں سستی برتے، تو ظاہر ہے نہ وہ طالب علم کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ ایسا تاجر خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس لئے اس بیماری سے بھی خود کو بچانے کی ضرورت ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب گناہ کرنے کا داعیہ پیدا ہو یا کسی فرض اور واجب کے ترک کا خیال آئے، تو انسان اللہ تعالی کے سامنے حضوری اور جواب دہی کا تصور کر لے، تو امید ہے کہ آہستہ آہستہ اس بیماری سے نجات ملے گی، لیکن اس کے لئے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہے، آدمی یہ طے کر لے کہ میں آج کے بعد فلاں غلط کام کبھی نہ کروں گا، یا مثلاً نماز کبھی نہ چھوڑوں گا، چاہے جی کرے یا نہ کرے، تو ان شاء اللہ یہ مرض دور ہوتا چلا جائے گا، ہاں! درمیان میں پھر کبھی کبھی خواہش کا تقاضا غالب آجائے اور پھر گناہ ہو جائے، تو گھبرانے کی ضرورت نہیں، انسان توبہ کرے اور دوبارہ پھر سے عزم مصمم کر لے، یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ انسان کے اندر حق و باطل اور نیکی و گناہ کی کشمش ہی نہ ہو اور ہمیشہ خیر ہی کا داعیہ پیدا ہو، کبھی بھی گناہ کا خیال ہی نہ آئے، یہ ممکن ہی نہیں، اور اللہ تعالی کا یہ مطالبہ بھی نہیں، وہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اس کا بندہ اس کا دھیان رکھے، نیکی کرے تو بھی اس کا دھیان رکھے اور وہ اس طرح کہ اس کا شکر ادا کرے، اور اگر گناہ ہو جائے تو بھی اس کا خیال رکھے، اس طرح کہ اسے یاد کر کے اس کے سامنے دو قطرے آنسو کے گرا دے اور معافی مانگ لے۔

پانچویں بیماری مفاد پرستی ہے، ایک بڑی بیماری ہماری یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر اپنے تمام اعمال و افعال اور حرکات و سکنات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس سے ہمارا کیا نقصان ہے یا ہمارا کیا فائدہ ہے؟ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم اپنے ہر عمل کو اس حیثیت سے دیکھیں کہ اس سے امت کا کیا نفع اور کیا ضرر ہے؟ اس لئے کہ اللہ تعالی نے ہمیں فرد سے زیادہ امت بنایا ہے، ہماری دو حیثیتیں ہیں ایک انفرادی اور ایک اجتماعی، لہٰذا کوئی بھی ایسا عمل ہم نہ کریں، جس میں ہمارا ذاتی فائدہ تو ہو، لیکن امت کا نقصان ہو، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انسان کا کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہوتا جس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہے، بلکہ اس کا اثر دوسروں تک ضرور پہنچتا ہے اور دوسرے لوگ لازماً اس سے متاثر ہوتے ہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک انسان اگر نماز نہیں پڑھتا تو وہ خود تو یہ

سمجھتا ہے کہ یہ اس کا ذاتی فعل ہے، نماز پڑھے یا نہ پڑھے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کا اثر اس کے بیوی بچوں اور دیگر افراد پر بھی پڑتا ہے، جب وہ نماز نہیں پڑھے گا، تو اس کی دیکھا دیکھی اس کے بچے بھی نماز میں سستی کرنے لگیں گے، یا اگر وہ جھوٹ بولتا ہے، تو اس کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اسی گناہ میں ملوث ہو سکتے ہیں، جب ایک ایسے عمل کا یہ حال ہے، جو ایک حد تک ذاتی حیثیت رکھتا ہے، تو ان اعمال کے بارے میں کیا کہا جائے، جو سراسر اجتماعی امور سے متعلق ہوتے ہیں، اس لئے اپنے ذاتی مفاد سے بالا ہو کر ہمیشہ امت کا مفاد ملحوظ رکھیں، ہماری حیثیت انفرادی سے زیادہ اجتماعی ہے، ہم ایک زنجیر کی کڑیاں اور ہار کی لڑیاں ہیں، اس لئے اگر ہمارے کسی عمل سے اس لڑی کے بکھرنے یا زنجیر کے ٹوٹنے کا خطرہ ہو، تو ہم کوشش کریں کہ ایسا نہ ہونے پائے۔

چھٹی بیماری بے حیائی، بے شرمی اور بے کاری کا ہے، اس وقت مسلم نوجوانوں میں دیگر قوموں کی طرح بے حیائی اور اباحیت پسندی کا رجحان زوروں پر ہے، شرم وحیاء اور عفت و پاک دامنی کے الفاظ سے معاشرے خالی ہوتے جارہے ہیں، اس بے حیائی کا ایک سنگین نتیجہ یہ ہے کہ امت کا ایک بڑا حصہ بے کاری میں مشغول ہے، ان کاموں میں گھنٹوں گذار دیے جاتے ہیں، جن میں نہ دین کا کوئی نفع ہوتا ہے اور نہ دنیا کا، بے حیائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے ریس ہوتی ہے، اور جو جتنا زیادہ بے حیاء ہوتا ہے، وہ خود کو اتنا ہی معزز سمجھتا ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ عورتیں بھی بے حیائی میں نہ صرف مردوں کے شانہ بشانہ ہیں؛ بلکہ ان سے ایک بالشت آگے ہی ہیں، اور جس معاشرہ کا یہ حال ہو جائے کہ اس کی اکثر تعداد ایسے ہی نازیبا کاموں میں زندگی بسر کر رہی ہو، تو اس پر اس طرح کے حالات نہیں آئیں گے، تو کیا آسمان سے من وسلوی کا نزول ہوگا! ضرورت ہے کہ معاشرہ سے اباحیت پسندی کے جذبہ کو دور کیا جائے اور عفت و پاک دامنی کے اصولوں پر اسے استوار کیا جائے۔

یہ تو ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر ہے، ورنہ کون سی بیماری ہے، جس میں ہم گرفتار نہ ہوں، کون سا فرض ہے جس کی بے حرمتی نہ کی جاتی ہو اور کون سا حرام کام ہے جسے دھڑلے سے نہ کیا جاتا ہو؟ پورا معاشرہ گناہوں کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا ہے، اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم اس کا ادراک کریں کہ یہ حالات ہمارے ان ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہیں اور جب تک ہم ان سے چھٹکارا نہیں پائیں گے اور دوبارہ سے اللہ تعالی کے دربار میں اپنی سعادت مندی اور نیاز مندی کا اظہار نہیں کریں گے، ہمارا ہر خواب ادھورا اور ناقص رہے گا، ہم اگر سوچ لیں کہ اتنی بڑی افرادی قوت اور بے پناہ وسائل رکھنے کے باوجود ہم ذلیل وخوار ہو رہے ہیں، دنیا بھر میں کسی ایک مذہب کے لوگ آپس میں اس طرح دست گریباں نہیں ہیں جس طرح ایک فرد، ایک رسول اور ایک قرآن کو ماننے والی یہ امت باہم برسر جنگ ہے، اس صورت حال سے نکلنے کا راستہ، امت مسلمہ کی ترقی کا راز کس نکتے میں پنہاں ہے اور مسلمان کس طرح موجودہ ذلت ورسوائی سے باہر نکل سکتے ہیں؟

ان مسائل کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم درج بالا امور سے اجتناب کرے اور اپنے درمیان اتحاد، ہم آہنگی پیدا کریں اور میانہ روی اور اعتدال پسندی کو اپنائیں اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شیطانیت اور انسانیت کی جنگ روز اول سے جاری ہے اور قیامت تک رہے گی، اور حالات زندہ قوموں پر ہی آتے ہیں، مردہ قوموں سے کوئی نبرد آزما نہیں ہوتا اور ہمارے پاس ہر مصیبت سے نمٹنے کے لیے دو مضبوط ہتھیار موجود ہیں ایک قرآن کریم اور دوسری نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ، لہٰذا ہمیں ہر معاملہ

میں ان دونوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے، یہ حالات ہمیں ایک ہمہ گیر خود احتسابی کی دعوت دیتے ہیں، مسلمانوں کو خود اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، ایک ایسا جائزہ جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو، ایک ایسا جائزہ جو رب کائنات سے رجوع اور اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرنے کے جذبے پر موقوف ہو، ہماری ناکامی نامرادی اور ذلت ورسوائی کا سبب قرآن وسنت کی تعلیمات سے دوری کے علاوہ کچھ نہیں، قرآن بتاتا ہے کہ انسانوں پر جو بھی مصیبت آتی ہے، وہ خود اس کی شامت اعمال کا نتیجہ ہے۔

اور ہمارے اعمال کیا ہے؟ وہ ہم سب کو معلوم ہیں، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر مومن کا جسم اور روح دونوں صحیح معنوں میں سیرت مصطفیٰ ﷺ کی پیروی میں لگ جائیں، وہ خدا کے سچے دین کا سچا داعی بن جائے، وہ ہدایت کا ایسا چراغ بن جائے جو جہاں بھی جائے اس کے اردگرد کا ماحول اس کے کردار اور اس کے پاکیزہ اخلاق کی کرنوں سے جگمگانے لگے، اس کے لباس، خوراک، رہن سہن، بودوباش، بول چال اور معاملات سے وہی خوشبو آئے جو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی سیرت سے آیا کرتی تھی، وہ حق کا پیغام گھر گھر پہنچانے پر کمربستہ ہوجائے، وہ اپنے اللہ کا فرمان اور پیغمبر ﷺ کی آواز بن جائے، اسے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہو اور اس پر نظر پڑے تو خدا یاد آجائے، اگر ہم نے اس پر غور وفکر نہیں کیا اور یوں ہی اعمال بد میں مبتلا رہیں اور ظلم پہ ظلم کرتے رہے تو پھر قانونِ خداوندی یہ ہے کہ اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ہے اور حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہود ونصاری ہوں، البتہ انھیں سنبھلنے کا موقع ضرور دیتا ہے مگر اس کی پکڑ بھی بہت سخت ہے، امتِ مسلمہ سے پہلے بنی اسرائیل تھے، یہ بھی ایک عظیم امت تھی اور حضرت موسیٰؑ کے امتی تھے اور تورات انکی کتاب الٰہی تھی، اللہ تعالی نے ان کو سارے جہاں پر فوقیت دی تھی، جب تک یہ لوگ اللہ اور اسکے رسول کے احکام پر عمل کرتے رہے ہر جگہ سرخرو اور کامیاب رہے، مگر جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے غافل ہوگئے تو اللہ تعالی نے ان کو کبھی یونانیوں، کبھی رومیوں کے ہاتھوں تباہ وبرباد کیا، باوجود اس کے کہ ان کو گمان تھا کہ ہم تو اللہ تعالی کے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اس لئے وہ ہمارے ساتھ خصوصی معاملہ کرے گا مگر اللہ تعالی نے ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے انکو تباہ وبرباد کردیا اور ان کی جگہ امتِ مسلمہ کو لے آیا۔

لیکن بدقسمتی سے آج امتِ مسلمہ کا بھی وہی حال ہورہا ہے جو ان سے پہلے بنی اسرائیل کا ہوا تھا ہر چند کہ ابھی ہمیں موقع ملا ہوا ہے، چنانچہ ہر بڑا "صدمہ" چاہے وہ عالمی سطح پر ہو یا ملکی سطح پر یہ سب امتِ مسلمہ کو بیدار کرنے اور انھیں خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے رونما ہورہا ہے، قرائن وشواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ تعالی ہم مسلمانوں سے ہرگز راضی نہیں ہے اور اسی وجہ سے امتِ مسلمہ ہر جگہ ذلیل وخوار ہورہی ہے، دوسری قوموں سے نصیحت اور عبرت نہ حاصل کرنے کی وجہ سے قدرت ایسے ہی عذاب نازل کیا کرتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ آسمان سے پتھر برسیں یا زمین الٹ جائے اور خوفناک چنگھاڑ سنائی دے، یہ عذاب کبھی تاتاریوں تو کبھی عیسائیوں، کبھی ہلاکو، کبھی چنگیز، کبھی تیمور کے حملوں کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور اب امریکہ اور اسرائیل کی شکل میں مسلط ہے، قدرت اسی طرح ایک غالب طاقت کو دوسری طاقت سے دفع کیا کرتی ہے اور سزا اور عقوبت کے لئے ظالم بادشاہوں کو مسلط کر دیتی ہے، اگر ہم فکر وتدبر سے کام لیں تو قرآن کا پیمانہ ہمارے سامنے ہے اس سے ہم خود کو پرکھ سکتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہمارے ساتھ کیا ہورہا ہے اور کیوں ہورہا ہے؟ آج ہمارے اندر "ایمان" کمزور ہے، مغرب کی تہذیب وفلسفہ نے ہمارے ایمان کی

جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے، ہم صرف "مسلمان" بن کر رہ گئے ہیں جو ایک نسلی عقیدے کے طور پر ہم کو ہمارے والدین سے ملتا ہے، ورنہ کیا ہم واقعی اللہ پر یقین رکھتے ہیں؟؟ کیا رسول ﷺ کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں؟؟ مجموعی طور پر ہمارا جواب نفی میں ہی ہوگا۔

اس لیے ہمیں دوسروں کو کوسنے اور الزام دینے سے پہلے اپنی اصلاح کرنی ہوگی اور اگر عذاب الٰہی سے بچنا ہے تو ہمیں توبہ کرنی ہوگی اور یہ توبہ حقیقی اور سچی ہو اور اپنے سابقہ اعمال پر واقعی ندامت ہو اور آئندہ کے لئے عزمِ مصمم ہو کہ اب اس گناہ کا ارتکاب دوبارہ نہیں ہوگا اور عملاً اس گناہ کو ترک کر دیا جائے اور اگر کسی کی حق تلفی کی ہے تو اس سے معافی مانگیں اور اس کی تلافی کریں ورنہ قیامت کے دن مظلوم کی برائیاں ظالم کو دے دی جائیں گی اور ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی، خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا یہ اسوہ رہا ہے کہ انھوں نے پہلے خود عمل کیا پھر دوسروں کو تلقین کی، تاریخ ہمیں بار بار متنبہ کر رہی ہے، عہد عباسی سے لیکر خلافتِ عثمانیہ تک کتنی بار مسلمانوں کا مختلف لوگوں کے ذریعے قتل عام ہوا تو کیا اس زمانے کے مسلمانوں نے اللہ تعالی سے مدد نہیں مانگی ہوگی؟ دعائیں نہیں کی ہوں گی؟ مگر کیوں دعائیں قبول نہیں ہوئی؟ دعائیں ضرور مانگیں گئی ہوں گی لیکن جب امت کے اجتماعی ضمیر کی موت ہو جائے اور وہ قرآن وحدیث سے مجموعی طور پر بھٹک جائے اور اعمال بد میں بری طرح مبتلا ہو جائے، تب دعاؤں کا مستجاب ہونا محال ہو جاتا ہے اور امت کا محاسبہ شروع ہو جاتا ہے، اس وقت صرف وہی لوگ نجات پاتے ہیں جو بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔

آج دنیائے اسلام کی زبوں حالی کی تصویر یہ ہے کہ پوری دنیا میں مسلمان زیر عتاب ہیں، اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف ہیں، ایسے دلدوز مناظر ہیں کہ بعض مقامات پر طاغوت کے ہاتھوں قتل ہونے والے مسلمانوں کی نماز جنازہ پڑھنے والا کوئی ہے نہ ان کی تدفین کرنے والے موجود، مسلمانوں کی نعشیں بکھری پڑی ہیں معصوم بچے اور خواتین خون میں نہلائے جا رہے ہیں لیکن اس زبوں حالی اور مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا علاج کیا ہے؟ امت مسلمہ کی زبوں حالی کا علاج اور امت مسلمہ کو موجودہ دگرگوں حالات سے نجات دلانے کی لیے قرآن وسنت کے احکامات کو استعمال میں لایا جائے تو بات بنتی نظر آتی ہے وگرنہ محال ہے، آج مسلمانوں کی حالت زار اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تمام مسلمان خصوصاً وارثین انبیاء کچھ عملی پروگرام اور لائحہ عمل بنائیں تو اس صورت میں امت مسلمہ کا کھویا ہوا وقار واپس آ سکتا ہے۔

وما علینا الا البلاغ

والسلام

مولانا عبدالحمید نعمانی
سابقہ جنرل سیکرٹری جمعیۃ علمائے ہند

فہم قرآن کے مختلف مناہج میں منہج اعتدال وصواب

قرآن حکیم نے بار بار انسانی سماج کو غور وفکر کر کے حقائق کو سمجھنے کی دعوت دی ہے، اس کے دائرۂ فکر ونظر میں خود کو بھی رکھا ہے کہ تم اس کی آیات میں غور کیوں نہیں کرتے ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالق قدیر کی رضا اور ناراضی کو جاننے کا قرآن مجید سے زیادہ مستند اور معتبر ذریعہ، اس دھرتی پر کوئی اور نہیں ہے، اس لیے امت مسلمہ نے اس کے افہام وتفہیم کے لیے درجنوں علوم وفنون کی ترتیب وتدوین کی ہے، قرآن کا ترجمہ وتفسیر بھی اسی کے زمرے میں ہیں، قرآن یقیناً عربی مبین کی زبان میں نازل ہوا ہے، تاہم وہ پوری دنیا کے انسانی سماج کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے پیغام اور ہدایت نامہ ہے، اس کے پیغام وہدایت سے روشنی حاصل کرنے اور پیغام کو سمجھ کر اس پر عمل کے لیے لازماً اس کی ضرورت ہے کہ اس کو اپنی زبان میں اپنی تہہ تک پہنچا جائے اور یہ اس کے مقاصد واغراض اور منشا کو سمجھے بغیر نہیں ہوسکتا۔

قرآنی حقائق ومعانی کے مختلف جہات

اس کے مدنظر اہل علم وفہم نے قرآنی حقائق ومعانی کو کھولنے کے لیے، مختلف جہات سے قرآن کے تراجم وتفاسیر تحریر کی ہیں، یہ کوششیں بھی قرآن کے معانی ومطالب تک پہنچنے پہنچانے کے عمل کے ذیل میں آتی ہیں، ہاں اس سلسلے میں ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مختلف زبانوں کے تمام تراجم وتفاسیر کو اس زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ آج جب ایسے تراجم وتفاسیر دستیاب ہیں جن کے مطالعے سے ظاہر وثابت ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ وتفسیر اپنے مخصوص عقائد ووافکار کے اثبات واظہار کے لیے کیا گیا ہے، مختلف اغراض ومقاصد کے تحت پہلے اپنے مخصوص عقائد ونظریات وضع کیے گئے اور بعد میں قرآنی آیات اور ان کے معانی ومفاہیم کو اپنے طور سے متعین کر کے ان پر منطبق کر دیا گیا ہے، اس سلسلے میں رسول پاک ﷺ اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے فکر وعمل اور زمانے وحالات کو پوری طرح نظر انداز کر دیا گیا، تمام تر انحرافات وتحریفات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

فہم قرآن اور جاہلی ادب

قرآن کے ترجمہ وتفسیر میں قدیم جاہلی ادب سے بھی بڑی مدد ملتی ہے، اس کے مطالعے سے فہم قرآن کی راہ بھی بہت حد تک آسان ہوجاتی ہے، اس پر ہندوستان میں مولانا حمید الدین فراہیؒ اور ان کے سلسلے میں ترجمہ وتفسیر نگار حضرات نے خاص طور سے توجہ دی ہے، انہوں نے نظم قرآن پر خصوصی توجہ کے پیش نظر آیات قرآنی سے آیات کی تفسیر میں جاہلی دور کے ادب سے خاص طور سے

استفادہ کیا ہے تاہم بہت سے مقامات پر روایات اوران پر مبنی متقدمین اہل علم کی تفاسیر پر مطلوبہ توجہ نہ دینے کی وجہ سے بات پوری طرح واضح نہ ہوسکی ہے اورفہم مسائل میں دقتوں کے ساتھ کئی طرح کے سوالات اوراشکالات دورنہیں ہو پائے ہیں، مثال کے طور پر سورہ نور، سورہ فیل، سورہ لہب اور سورہ عبس وغیرہ کے ترجمہ وتفسیر کے ذیل میں بحث کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک ہے فہم قرآن کے لیے احادیث، قوموں کے ثابت شدہ اور متفقہ واقعات، گزشتہ انبیاء کے صحیفے، آثار صحابہ وتابعین سے انسانی یعنی ہماری ضرورت واحتیاج کے تحت مدد لینا اور دوسری بذات خود قرآن کا ان کا محتاج ہونا، ظاہر ہے کہ دونوں میں تعبیر کے لحاظ سے فرق ہے، قرآن کی بہت سی ایسی آیات ہیں جن کی تفہیم وتفسیر میں مذکورہ ماخذ کی ہمیں ضرورت ہے، ان کے بغیر ان کے مقصد و مراد تک رسائی مشکل اور افہام وتفہیم دشوار تر ہوجاتی ہے۔

مکتب فراہی کی بنیادی غلطی

مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ہمارے دل میں بہت احترام ہے، تاہم انھوں نے اوران کے پیروکاروں نے جس انداز و اسلوب میں مذکورہ ماخذ کے تعلق اظہار خیال کیا ہے، اس سے ان کی مطلوبہ اہمیت وحیثیت باقی نہیں رہ جاتی ہے، اسے سمجھنے جاننے کے لیے، مولانا فراہیؒ کی مختلف سورتوں اور آیات کی تفسیر ''نظام القرآن'' اور دیگر چھوٹے بڑے کتب ورسائل اوران کے تلمیذ رشید مولانا امین احسن اصلاحی کے ترجمہ وتفسیر ''تدبر قرآن'' اور مولانا اصلاحی کے شاگرد جناب جاوید احمد غامدی کے اپنے ترجمہ وتفسیر قرآن ''البیان'' اور بنیادی کتاب ''میزان'' کو دیکھا جاسکتا ہے۔

مولانا فراہیؒ نے ''نظام القرآن'' کے مقدمے اپنے مؤقف کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) احادیث وروایات کے ذخیرے سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں، نہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کردیں۔

(۲) سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کرلیتے ہیں، جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت یا حضرت محمد ﷺ کے خلاف وحی، قرآن پڑھ دینے کی روایت، اس طرح کی روایت کے بارے میں ہم کو نہایت محتاط ہونا چاہیے۔

(۳) یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن اپنی تفسیر کے لیے ان فروع (احادیث، قوموں کی ثابت شدہ متفقہ واقعات وغیرہ) کا محتاج نہیں ہے، وہ تمام کتابوں کے لیے خود مرکز ومرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اختلاف واقع ہو تو اس کی روشنی جھگڑے کو مٹا دینے والی بنے گی لیکن قرآن مجید کی تصدیق وتائید کی ضرورت ہو تو ان فروع کی مراجعت سے تمہارے ایمان واطمینان میں اضافہ ہوگا۔

(۴) میرے نزدیک سب سے بے خطر راہ یہ ہے کہ استنباط کی باگ قرآن مجید کے ہاتھ میں دے دی جائے، اس کا نظم و سباق جس طرف اشارہ کرے، اس طرف چلنا چاہیے، (یہ اقتباسات نظام القرآن کے مقدمہ ص ۳۸ سے ۴۰ تک سے لیے گئے ہیں، البتہ پانچواں اقتباس کتاب کے صفحہ ۴۵۱ سے لیا گیا ہے)

مذکورہ اقتباسات سے یہ ثابت اور ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ کے نزدیک مرجع کی حیثیت، صرف قرآن کو حاصل ہے اور روایات کو تفسیر آیات میں بنیاد کی حیثیت نہیں بلکہ تائید وتصدیق کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے،

اصل بات

لیکن اس سے یہاں یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ وہ روایات سے استفادہ کے قائل نہیں ہیں، وہیں یہ بھی کہنا صحیح نہیں ہے کہ مولانا فراہیؒ نے روایات اور آثار واحادیث کو عام اہل علم وفکر کی طرح ہی مطلوبہ درجہ وحیثیت دی ہے، یہ لکھنا اس لیے بھی ضروری لگتا ہے کہ کچھ لوگ محض کچھ باتوں اور اختلافات کی وجہ سے مولانا فراہیؒ اور ان کے تلمیذ عظیم مولانا امین احسن اصلاحی کو روایات واحادیث کے منکرین کی فہرست میں ڈالنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ منکرین حدیث وسنت بھی، ان کی کچھ باتوں کو سیاق وسباق سے الگ کرکے اپنے مؤقف کو تقویت دینا چاہتے ہیں، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا فراہیؒ جن کی تفسیر قرآن مکمل نہیں ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی جن کی مکمل تفسیر قرآن ''تدبر قرآن'' کی شکل میں ہے، روایات وآثار واحادیث سے عموماً مدد نہیں لیتے ہیں، بیشتر مقامات پر آیات کی تفسیر دیگر آیات، سیاق وسباق نظم اور جاہلی ادب کے مدنظر ہی کرتے ہیں۔

مولانا اصلاحی کی تفسیر

مولانا اصلاحی کی نو جلدوں پر مشتمل تفسیر ''تدبر قرآن'' میں پچاس ساٹھ سے زیادہ احادیث وروایات نہیں ہوں گی، واضح رہے کہ مولانا فراہی تفسیری روایات میں احادیث وآثار صحابہؓ وتابعین دونوں کو شامل کرتے ہیں اور عموماً دونوں کو ایک زمرے میں رکھتے ہیں، وہ احادیث وروایت اور اقوام کے متفقہ روایات، حضرات انبیاء سابقین کے محفوظ صحائف کو ایک درجے میں رکھتے ہیں اور ان کو وہ فرع قرار دیتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا فراہی عموماً احادیث کے لیے روایات اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین کے اقوال وآراء کے لیے احادیث کا استعمال کرتے ہیں، اس سلسلے میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جو وضاحت کی ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے، چاہے وہ روایات وآثار کو ایک مخصوص طرز سے پیش کرتے ہیں، لیکن ان کو کلیتاً مسترد نہیں کرسکتے ہیں، ان کو یہ معلوم ہے اور ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ فہم قرآن میں روایات وآثار بھی مدد ومعاون ہیں، چناں چہ مقدمہ نظام القرآن ص ۳۵ پر یہ لکھتے ہیں: ''پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے، اس کے بعد نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کا فہم، مجھے سب سے پسند وہی تفسیر ہے جو پیغمبر ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو۔''

منہج فراہی

اصولی طور پر مولانا فراہیؒ اس اقتباس میں وہ بنیاد تفسیر تسلیم کرتے ہیں، جسے عام طور سے تسلیم کیا جاسکتا ہے، ''اصولی'' کا لفظ ہم نے عمداً اس طرف متوجہ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کہ عملی طور پر کئی سارے مقامات پر انھوں نے اصولی دعوے کے برعکس باتیں لکھی ہیں، اس کی مثال دوسرے نمبر کا اقتباس ہے، اس میں جس روایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ بخاری شریف میں موجود ہے، اس سلسلے میں مولانا فراہیؒ تنہا نہیں ہے، اس پر شبہات واعتراضات امام رازیؒ، مولانا مودودیؒ اور حفظ الرحمن سیوہارویؒ وغیرہم

کے یہاں بھی ملتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے تناظر میں تفسیر کبیر، تفہیم القرآن اور قصص القرآن میں دیکھا جاسکتا ہے، روایت کے تعلق سے شروح حدیث میں لفظ کذب کی توریہ سے تعبیر وتشریح کی گئی ہے، متکلم اور مخاطب میں لفظ کے قریب وبعید میں الگ الگ معنی ہوتے ہیں، فراہی مکتب فکر کے حوالے اس لیے دیئے گئے ہیں کہ فہم قرآن کے مختلف منہاج میں سے ایک منہج قرآن کے تعلق سے سامنے آجائے کہ اس کا ایک طریقہ ومنہج یہ بھی ہے۔

فہم قرآن کے مختلف مناہج

گزشتہ کئی صدیوں سے اب تک فہم قرآن کے کئی منہاج تحریری شکل میں سامنے آئے ہیں، ان میں انتخاب ایک بڑا مسئلہ ہے، اگر صاحب علم وفکر، اساتذہ سے باقاعدہ علمی استفادہ کیے بغیر اپنے طور سے فہم قرآن خصوصاً شرعی احکام اور مسائل بتانے اور ان کی تشریحات وتعبیرات اختیار کی جائیں تو بسا اوقات آدمی، انحرافات اور کج فہمیوں کا شکار ہوکر خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرڈالتا ہے، اس کے بہت سے حوالے سے اور نمونے پیش کیے جاسکتے ہیں اور سماج میں آج بھی اس کے چلتے پھرتے نمونے مل جاتے ہیں، اس تناظر میں سرسید احمد خاں، عبداللہ چکڑالوی، حافظ اسلم جیراجپوری، ان کے شاگرد غلام احمد پرویز، میاں عبدالصمد بدایونی، ڈاکٹر فضل الرحمن، پروفیسر محمد اجمل خاں، خواجہ عباداللہ اختر، الطاف جاوید، جاوید احمد غامدی وغیرہم کی بہت سی قرآنی آیات و تفاسیر میں مختلف قسم کے انحرافات اور معنوی تحریفات کے نمونے مل جائیں گے، اگرچہ جاوید احمد غامدی کو غلام احمد پرویز کے زمرے میں رکھنا زیادہ صحیح نہیں ہوگا، وہ زیادہ تر مسائل ونظریات میں فراہی مکتب فکر سے قریب نظر آتے ہیں، جناب غامدی صاحب نے اپنے ترجمہ وتفسیر ''البیان'' میں زیادہ تر استفادہ مولانا امین احمد اصلاحی کے ترجمہ وتفسیر ''تدبر قرآن'' سے کیا ہے، اس کے علاوہ جاوید احمد غامدی اور ان کے تلامذہ نے غلام احمد پرویز کے تفسیری مؤقف ومنہج پر تنقید کرتے ہوئے بہت سی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے، مگر فہم قرآن کے اساس اور طریق کے سلسلے میں احادیث وآثار کے اس طور کا اعتنا ولحاظ نہیں پایا جاتا ہے، جس کے نمونے ہمیں تفسیر طبری سے لے کر معارف القرآن وغیرہ میں ملتے ہیں، گزشتہ کچھ برسوں سے جدید تعلیم یافتہ افراد کی ایک بڑی تعداد مولانا وحیدالدین خاں کے ترجمہ وتفسیر ''تذکیر القرآن'' اور غامدی کی دیگر تحریروں، میزان، برہان کے ساتھ ترجمہ وتفسیر ''البیان'' کی طرف خاص توجہ دے رہی ہے، تاہم ان کی تفسیر میں بہت سے مقامات پر مطلوبہ تفصیلات نہیں ملتی ہیں، خصوصاً احکام سے متعلق۔

مولانا وحیدالدین خان کا تفسیری منہج

مولانا وحیدالدین خان کے نزدیک قرآن حکیم کتاب معرفت ہے نہ کہ کتاب الاحکام جب کہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن میں معرفت کے ساتھ مختلف امور کے سلسلے میں احکام بھی پائے جاتے ہیں، ہمارے کئی ذی احترام اہل علم کی احکام القرآن کے نام سے مفصل ومختصر کتابیں موجود دستیاب ہیں، مذکورہ طبقے کی ایک تعداد مولانا آزادؒ کے ترجمہ وتفسیر ''ترجمان القرآن'' کی مطالعے میں دل چسپی رکھتی ہے، گرچہ اس میں بھی سورہ فاتحہ کے سوا دیگر سورتوں کی بہت جگہوں پر تفصیلات نہیں ملتی ہے، تاہم عموماً ایک مخصوص اسلوب و انداز سے آیات قرآن کے افہام وتفہیم کی سعی کی گئی ہے، یہ اور بات ہے کہ فقہی مسائل واحکام پر اس طور سے توجہ نہیں دی گئی ہے، جس

کے نمونے حضرت تھانویؒ کی بیان القرآن، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی تفسیر معارف القرآن، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر ماجدی اور مولانا صوفی عبدالحمید سواتی کی تفسیر معالم العرفان حتی کہ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن، مولانا غلام رسول سعیدی کی تبیان القرآن وغیرہ میں ملتے ہیں، ویسے بھی مولانا وحیدالدین خاں اور غامدی صاحب کا جو اسلوب تحریر اور نہج ہے اس میں قرآن حکیم کی متعلقہ آیات کے فقہی احکام ومسائل کے بیان کے لیے زیادہ گنجائش نہیں ہوسکتی ہے، تاہم یہ بھی فہم قرآن کا ایک منہج ہے۔

روایات وآثار کو مطلوبہ جگہ نہ دینے کی وجہ

روایات وآثار کو مطلوبہ اور بقدر ضرورت بھی جگہ نہ دینے کا ایک بڑا سبب غالبا ایک خاص طبقے جس میں شیعہ وسنی دونون شامل ہیں، کا قرآنی آیات کے افہام وتفہیم میں انتہائی ضعیف بلکہ بہت سی بے اصل وموضوع روایات وآثار کثرت سے حوالہ بھی ہے، فضائل اور ترغیب وترہیب کے لیے ضعیف روایات پیش کرنا بالکل الگ معاملہ ہے، لیکن اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اصل اور موضوع کی حد تک اسرائیلی اور دیگر روایات وآثار پیش کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ آیات کا سیاق وسباق کیا ہے اور پیش کردہ روایات وآثار سے آیات کے بیان کردہ مفہوم ومعنی کی تائید ہو رہی ہے کہ نہیں؟

محمد اجمل خان اور الطاف جاوید کے فہم قرآن کا انداز

مذکورہ حضرات میں سے محمد اجمل خان، الطاف جاوید جیسے حضرات کا بھی ایک طبقہ ہے جس کا کہنا بلکہ دعوی ہے کہ فہم قرآن کے لیے ترتیب نزولی کا اعتبار ولحاظ ضروری ہے، اس کے بغیر قرآن کی بنیادی تعلیمات اور نصب العین تک رسائی نہیں ہوسکتی ہے، اس لیے ترتیب نزولی اور طبقاتی نقطہ نظر ہی درست ذریعہ ہے اور صرف یہی ذریعہ عہد حاضر میں تفہیم قرآن کے لیے ایک ضروری منہاج کی حیثیت رکھتا ہے، اس طبقے کے اہم نمایندے الطاف جاوید کا یہاں تک دعوی ہے کہ اس کے سوا دوسرے نقطہ ہائے نظر سے آج تک قرآن سمجھا نہیں جاسکا اور اسی سبب سے کوئی قدم بھی نہیں اٹھایا جاسکا، محض ظواہر اور قرآنی سزاؤں کی اساس پر نہ کوئی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ ہی آیندہ آنے کی امید ہے، ہر کوشش آج تک ناکام رہی ہے، اس کی تفصیل الطاف جاوید کی کتاب ''انقلاب مکہ'' اور ''فہم قرآن کے جدید منہاج'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بعض دانشوروں کا دعویٰ فہم قرآن

بدلتے حالات اور زمانے کے اثرات تو ہوتے ہیں، قرآن کی بنیادی اصطلاحات میں سے کچھ کے متعلق ترجیحات میں تھوڑا فرق پیدا ہوسکتا ہے، لیکن ان کے تعلق سے یہ کہنا کہ امت کے سارے اہل علم وفکر کی آنکھوں سے معانی ومفاہیم اوجھل ہوگئے تھے اور مجہول کیفیت پیدا ہوگئی تھی جیسا کہ مولانا آزاد نے ''ترجمان القرآن'' کے مقدمے اور مولانا مودودی نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات اور الطاف جاوید نے مذکورہ کتاب میں لکھا ہے فہم قرآن کے تعلق سے راست رویہ نہیں ہوسکتا ہے، قدیم مسائل کی تفہیم کے لیے جدید طرز استدلال بالکل الگ بات ہے، لیکن قرآن کی آیات اور ان کی بنیادی تعلیمات اور نصب العین تک اتنے طویل عرصے

تک نارسائی اور عدم فہم کی بات قطعی نا قابل قبول ہے، یہ خیال قرآن حکیم کی اثر انگیزی اور ہر زمانے میں ہدایت نامہ ہونے کے تصور اور رسول پاک ﷺ کی طرف سے اہل حق ہونے اور تحریفات کو دور کرنے والے طبقے کی موجودگی کی پیش گوئی کے بھی منافی ہے، موجودہ قرآن عہد رسالت اور زمانہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں مرتب ہوا تھا، اور یہ ترتیب وتدوین توفیقی ہے، اس کو کلی طور سے مسترد کر کے نزولی ترتیب اور طبقاتی نقطہ نظر پر فہم قرآن کو موقوف ومنحصر کر دینا، بذات خود ایک صحیح منہاج فہم قرآن سے منحرف رویہ ہے اور روایات وآثار، امت کے عمل توارث اور اہل علم وفکر کی کاوشوں کی تحقیر وتخفیف اور اپنے آپ میں گمراہی اور منزل سے دور کرنے والی روش ہے۔

غلام احمد پرویز کا منہج

فہم قرآن کے سلسلے میں غلام احمد پرویز جیسے برخود غلط سے استفادہ اور حوالہ دینے کو فہم قرآن کے جدید منہاج کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ مولانا آزادؒ کے سیکرٹری پروفیسر محمد اجمل خاں نے مولانا عبید اللہ سندھی کی ترغیب پر قرآن کریم کی ترتیب نزولی کی تحقیق کی تھی، ترتیب نزولی کا علم اور اس پر فہم قرآن کو موقوف قرار دینا دونوں الگ الگ باتیں ہیں، ہمیں نہیں لگتا کہ مولانا سندھی نے فہم قرآن کے لیے ترتیب نزولی کی تحقیق کے لیے کہا ہوگا، ان کے دروس اور قرآن کے انقلابی نظریات کے تعلق سے کئی حوالے اور بیانات موجود ہیں، علامہ سندھی کچھ امور کے سلسلے میں اپنا جدا انقلابی نظریہ رکھتے تھے اور عام ڈگر اور روش سے الگ چلتے تھے، لیکن وہ ترتیب نزولی پر فہم قرآن کو موقوف سمجھیں یہ نا قابل فہم اور تفصیل طلب موضوع بحث ہے، جس کی یہاں سر دست گنجائش نہیں ہے۔

فہم قرآن کا صحیح منہج

ہمیں سر دست ماضی سے حال تک فہم قرآن کے مختلف منہاج کا ذکر کرتے ہوئے اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ فہم قرآن کا وہی منہاج صحیح ہے جو جمہور امت اور اس کے اہل علم وفکر، اسلاف واکابر کا ہے، اور جس کے مطابق ہمارے دوست اور درسی ساتھی مفسر قرآن مولانا آزاد انیس بلگرامی قاسمی زید علمہ نے قرآن کا ترجمہ وتفسیر کیا ہے، بہت سے لوگ قابل اور ذہین ہوتے ہیں لیکن ذہانت اور قابلیت، صحت فکر ونظر کے لازماً ہم معنی نہیں ہے، ایسے افراد عموماً اپنے وقت کے غالب نظریہ اور عصری استدلال کے طرز وطریقہ سے متاثر ہو کر بسا اوقات کئی بنیادی امور اور حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جناب پروفیسر محمد اجمل خاں بھی، رابندر ناتھ ٹھاکر کی قائم کردہ یونیورسٹی شانتی نکیتن میں موجود قرآن کی ترتیب نزولی پر کام کرنے والے مستشرقین سے متاثر ہو گئے تھے اور کئی مغربی ویورپی دانشوروں نے ہی مطالعہ قرآن کے دوران ترتیب نزولی کو معلوم کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا تھا، اس پر فہم قرآن کو منحصر اور مبنی قرار دینا، غیر ضروری عمل اور موجودہ مصحف کی ترتیب کے متعلق مختلف قسم کے شکوک کو راہ دے کر فہم قرآن کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا عمل ہے۔

علامہ شوکانیؒ اور نظریہ نظم قرآن

علامہ شوکانیؒ نے (فتح القدیر الجامع فی الروایۃ و الدرایۃ من علم التفسیر مطبوعہ مصطفی البابی الجلبی مصر ۱۹۶۴ء جلد اول) میں اگرچہ نظم قرآن کے نظریہ کی سخت مخالفت کی ہے، تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ موجودہ ترتیب مصحف،

ترتیب نزولی کے مطابق نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ اور فہم قرآن اس پر موقوف نہیں ہے، یہ موجودہ ترتیب رسول پاک ﷺ کے عہد کی ہے اور آپ ﷺ نے ہی وحی الٰہی کی روشنی میں خاص مقاصد کے تحت آیات کو خاص خاص مواقع پر رکھا ہے، سورتوں کی حد بندی اور ترتیب بھی ہدایت نبی ﷺ کے مطابق عمل میں آئی ہے، اس لیے ترتیب مصحف کے سلسلے میں نظم وترتیب سے انکار کرنا بھی راست رویہ نہیں ہے۔

تفسیر میں احادیث واثار کے بجائے محض عقلی توضیح راست رویہ نہیں

اس کے ساتھ روایات وآثار کو خصوصا جو صحیح سند سے مروی ہوں، نظر انداز کرنا، ان کے متعلق بے توجہی و بے اعتنائی کی روش، یقینی طور سے فہم قرآن میں رکاوٹیں اور دقتیں پیدا کرتی ہیں۔ خاص طور سے اجماع اور جمہور کی تحقیق وتفسیر کے خلاف آیات قرآنی کی تفسیر وتوضیح اور تاویل بعید، ذمہ دارانہ عمل نہیں ہے۔ اس سے جہاں سلف کے متعلق بے اعتمادی، جو گمراہی اور انحراف کی پہلی بنیاد ہے، پھیلتی ہے اور دین وشریعت کے متعلق مطلوبہ ضروری اہلیت نہ ہونے کے باوجود بہت سے لوگوں کو بے جا جسارت وجرآت کی راہ ملتی ہے، اس کی مثال سرسید کی تفسیر اور اس سے متاثر افراد میں ملتی ہے۔

کہیں کہیں علامہ سید رشید رضا مصری کی تفسیر المنار اور دیگر تفاسیر میں ایسی باتیں ملتی ہیں کہ بخاری ومسلم کی روایات کو بھی نظر انداز کر کے خاص طرح کی عقلی توضیح وتفسیر پیش کی گئی ہے، اگر حضرات انبیاء علیہم السلام عموماً اور رسول پاک ﷺ کی عصمت وکردار کے متعلق، کسی روایت سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے تو اس کے راوی کی غلطی کے امکان کے تناظر میں مناسب تاویل وتوضیح الگ بات ہے، لیکن اس طور سے صحیح سند سے مروی روایات وآثار کی تردید وتکذیب، غلط ہے کہ ان کے متعلق تشکیک وتحقیر کی فضا قائم ہو جائے، یہ فہم قرآن کے تعلق سے وہ پہلو ہے جو عقل وذہانت کے راستے سامنے آتا رہا ہے۔

فہم قرآن کا دوسرا پہلو

اس کے برعکس فہم قرآن کے سلسلے میں ایک دوسرا پہلو ہے جو نافہمی اور بے شعوری کی بنیاد پر سامنے آتا رہتا ہے وہ یہ کہ قرآن اور اس کے احکام ومسائل کے فہم کے لیے ضروری دینی وفنی علوم کے حصول کی ضرورت ہے، نہ کہ کسی عالم یا مفتی اور فقیہ کی، کیونکہ وہ آسان ہے، ہر آدمی اپنے طور پر اسے نہ صرف یہ کہ خود سمجھے بلکہ دوسروں کو بھی سمجھائے، قرآن میں صاف طور سے کہا گیا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (القمر: ۱۷) اور تحقیق ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے، نصیحت (اور حفظ) کے لیے، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا۔

فہم قرآن کے لیے مہارت فی العلوم کی ضرورت

اس کا مطلب اور مقصود یہ نہیں ہے کہ قرآن اور اس کے احکام ومسائل کے فہم کے لیے معتبر، مستند استاذ اور فنی وضروری علم کی ضرورت نہیں ہے اور ہر آدمی اپنے طور پر قرآن کو سمجھے اور سمجھائے، بلکہ مطلب ومقصود یہ ہے کہ اس پر کسی خاص برادری یا قبیلہ کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ اس کے فہم واستفادہ کے لیے راہ کھلی ہوئی ہے، قرآن کے افہام وتفہیم کے فطری طریقوں کو اختیار کر کے، استفادہ و

عمل کرے، دوسرے یہ کہ قرآن میں قیامت، آنے والے دن، آخرت، سابقہ اقوام کے حالات واقعات، انجام، ترغیب وترہیب وغیرہ کے متعلق جو باتیں ہیں، وہ اس قدر صاف اور واضح ہیں کہ مخلص اور صاف دل والے کے لیے سمجھنا آسان ہے، لِلذِّکرِ کی ایک تفسیر حفظ کے لیے بھی قرآن کو آسان کردیا ہے، اسے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور دیگر مفسرین نے بھی اختیار کیا ہے، اس پر پورے مسئلے پر نظر ہونے کی وجہ سے غلط طور سے اعتراض کیا ہے، کیونکہ اس دوسری تفسیر کی آیت میں پوری گنجائش ہے، اگر قرآن پڑھ کر اس کی بعض امور واحکام، حسن وقبح سمجھ لینے کی بات ہو تو اس میں زیادہ اختلاف کی گنجائش نہیں ہے لیکن فہم قرآن سے غرض ومقصد اور ہے، اس کے کئی درجات ہیں مثلاً یہ مجتہدانہ طور سے احکام کا استنباط کرے، جیسا کہ ہمارے فقہاء اور مجتہدین نے کیا ہے، قرآن کی آیت کا صحیح وواقعی مفہوم ومطلب متعین کیا جاسکے، اس کے مدلولات کو جان سکے، وغیرہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ یہ نصیحت اور حفاظ سے بہت حد تک جدا معاملہ ہے۔

فہم قرآن کے مختلف مناہج میں احتیاط کی ضرورت

علمی دھماکے کے عہد جدید میں قرآن کی طرف رجوع کا رجحان یقیناً بڑھ رہا ہے، اس کے تحت فہم قرآن کے مختلف منہاج سامنے آرہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ فہم قرآن کے ہر منہج کو اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے، احتیاط وذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ معروف ومعتبر سلسلہ علم وفکر کے تحت فہم قرآن کے منہاج کو اختیار کیا جائے، اسی زمرے میں الخیر فاؤنڈیشن کی طرف سے پیش کردہ ترجمہ وتفسیر ''اظہار القرآن'' بھی آتا ہے، جس میں مستند ومعتبر تراجم وتفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے فہم قرآن کی آسان اور سیدھی راہ دکھائی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے استفادے اور افادے کو عام وتام فرمائے۔ امین

مولانا محمد کامران ہوتی
دارالعلوم رحمانیہ پار ہوتی مردان

تفسیر بیضاوی پر ایک نظر

تفسیر بیضاوی کا اصل نام انوار التنزیل واسرار التاویل ہے، تفاسیر بالرائے میں تفسیر بیضاوی کو بہت بلند مقام حاصل ہے، عرصہ دراز سے یہ تفسیر درسِ نظامی میں شامل ہے، حاجی خلیفہ اِس تفسیر کے متعلق فرماتے ہیں

وتفسیرہ ھذا کتاب عظیم الشأن ،غنی عن البیان، لخص فیہ من الکشاف ما یتعلق بالإعراب، والمعانی، والبیان ومن التفسیر الکبیر ما یتعلق بالحکمۃ، والکلام ومن تفسیر الراغب ما یتعلق بالاشتقاق، وغوامض الحقائق، ولطائف الإشارات(۱)

قاضی بیضاویؒ کی یہ تفسیر ایسی عظیم الشان کتاب ہے، جو کسی تذکرہ کا محتاج نہیں ہے، اِس تفسیر میں اعراب، معانی اور بیان کے مباحث کشاف سے ماخوذ ہیں، حکمت اور کلام سے متعلق علوم تفسیر کبیر سے لی گئی ہیں، اور اشتقاق سے متعلق مسائل امام راغب اصفہانی کی تفسیر سے مستفاد ہیں۔

اِس تفسیر کے مصنف قاضی بیضاویؒ کو تمام علوم نقلیہ اور عقلیہ میں ملکہ حاصل تھا اور آپ نے اِن علوم میں مستقل کتابیں یا اِن علوم سے متعلق متون کی شروحات بھی لکھی تھیں، اِس لیے قاضی نے اپنے تفسیر میں اِن تمام علوم کو جمع کیا ہیں، جب قاضی کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کسی فن میں اپنی ماہرانہ رائے دیتے ہیں، تو قاری سمجھتا ہے، کہ آپ اِس فن میں ماہر ہیں، لیکن مسلسل مطالعہ سے یہ خیال جاتا رہتا ہے، اِس لیے کہ کہ ہر فن میں قاضی کا یہ انداز ہوتا ہے، چنانچہ قاضی کے ہاں قاری کو علم لغت، نحو، صرف، قراءت، منطق، علم الجدل، علم الفلسفہ، فقہ، اصول الفقہ، علوم القرآن، تاریخ اور تصوف ایسے دلنشین اور تفصیلی انداز سی ملتے ہیں، کہ گویا اِن مسائل کو سمجھنے کے لیے یہی تفسیر کافی ہے، اِن خصوصیات کی وجہ تفسیر بیضاوی دیگر تفاسیر بالرائے سے ممتاز ہے، ذیل میں تفسیر بیضاویؒ میں قاضی بیضاویؒ کا مختلف علوم کے بارے مؤقف ذکر کیا جاتا ہے۔

علم النحو

قاضی بیضاوی کو نحو میں کمال حاصل تھا، آپؒ نے علم الإعراب کے متعلق لب اللباب فی علم الإعراب(۲) کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہیں، کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی نحو کے بارے میں ایسے ماہرانہ کلام کرتے ہیں، کہ بڑے بڑے نحوی حیران رہ جاتے ہیں، چنانچہ کبھی کسی آیت میں وجوہ اعراب ذکر کرکے ان میں کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں، کبھی نحاۃ کے ایک مسلک کو دوسرے پر بڑے مدلل انداز سے ترجیح دیتے ہیں، محاکمہ کرتے وقت اکثر بصریین کے مسلک کی طرف جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے، بسم اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والاسم عندأ صحابنا البصريين من الأسما التى حذفت أعجازها لكثرة الاستعمال، وبنيت أوائلها على السكون، وأدخل عليها مبتدأ بها همزة الوصل (۳)

ہمارے اصحاب بصریین کے ہاں اسم ان کلمات میں سے ہے، جن کا لام کلمہ حذف کیا گیا ہو، اور ان کے ابتداء کو ساکن کر کے شروع میں ہمزہ وصل ذکر کیا گیا ہو۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۴) اِس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والمتعدى خاصة فى دخولها على اسمين. ولذلك أعملت عمله الفرعى وهو نصب الجزء الأول ورفع الثانى إيذانا بأنه فرع فى العمل دخيل فيه. وقال الكوفيون: الخبر قبل دخولها كان مرفوعا بالخبرية وهى بعد باقية مقتضية للرفع قضية للاستصحاب فلا يرفعه الحرف (۵)

إن صرف دو اسموں کی طرف متعدی ہو کر دونوں میں عمل کرتا ہے، اور چونکہ یہ فعل کے مشابہ ہو کر عمل کرتا ہے، اِس لیے فعل کا عملِ فرعی دیتا ہے، یعنی پہلے جزء کو نصب اور دوسرے کو رفع دیتا ہے، جبکہ کوفیین کہتے ہیں کہ: إن کا خبر اِس کے داخل ہونے سے پہلے مرفوع تھا، تو اب بھی استصحابِ حال کی وجہ سے مرفوع ہوگا۔ گویا اِن اِس میں عمل نہیں کرے گا۔

قاضیؒ بصریین اور کوفیین کے مسلکوں کو ذکر کرنے کے بعد بصریین کے مسلک کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

وأجيب بأن اقتضا الخبرية الرفع مشروط بالتجرد لتخلفه عنها فى خبر كان وقد زال بدخولها فتعين إعمال الحرف (۶)

خبر تب مرفوع ہوتی ہے، جب وہ عاملِ لفظی سے خالی ہو، اور اس کی دلیل یہ ہے، کہ کان کی خبر عاملِ لفظی سے خالی نہ ہونے کی وجہ سے مرفوع نہیں ہوتی اور جب عاملِ لفظی سے خالی ہونے کی شرط اِن کے داخل ہونے سے ختم ہو گیا، تو اب عمل کرنا ضروری ہے۔

اِن دونوں مثالوں میں قاضیؒ نے بصریین کے مسلک کو ترجیح دی اور اپنے آپ کو بصریین میں شمار کیا۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ (۷) اِس جگہ اعراب کے بارے میں بڑی فاضلانہ گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَالْأَرْحَامَ بالنصب عطف على محل الجار والمجرور كقولك: مررت بزيد وعمرا، أو على اللّٰه أى اتقوا اللّٰه واتقوا الأرحام فصلوها ولا تقطعوها. وقرأ حمزة بالجر عطفا عل الضمير المجرور وهو ضعيف لأنه كبعض الكلمة وقرئ بالرفع عل أنه مبتدأ محذوف الخبر (۸)

اَلْأَرْحَام جار مجرور کے محل پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، جیسے مررت بزید وعمرا یا لفظِ اللّٰہ پر عطف ہو کر اتقوا کا مفعول بہ ہے، اور معنی یہ ہے، کہ رشتوں کو جوڑوں اور ان کو مت کاٹو، حمزہ نے اِس کو ضمیرِ مجرور پر عطف کر کے مجرور پڑھا ہے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے، اِس لیے کہ ضمیر مجرور کلمہ کے جزء کی طرح ہوتا ہے، بعض نے اِس کو مبتداء اور اِس کی خبر کو محذوف مان کر مرفوع پڑھا ہے۔

اِس آیت میں قاضیؒ نے جر کی قرآت کو ضعیف کہا ہے، اور یہی قول محققین نحاۃ کا بھی ہے، چنانچہ مشہور نحوی ابوجعفر النحاس فرماتے ہیں

وقرأ إبراهيم وقتادة وحمزة والأرحام بالخفض وقد تكلم النحويون في ذلك. فأما البصريون فقال رؤساؤهم: هو لحن لا تحل القراءة به، وأما الكوفيون فقالوا: هو قبيح ولم يزيدوا على هذا ولم يذكروا علة قبحه فيما علمته. وقال سيبويه: لم يعطف على المضمر المخفوض لأنه بمنزلة التنوين (۹)

ابراہیم، قتادہ اور حمزہ کے ہاں الأرحام کو مجرور پڑھا جائے گا۔ جبکہ نحویوں کے ہاں اِس اعراب میں کلام ہے، بصریین تو اِس کو غلط اور ناجائز سمجھتے ہیں، اور کوفیین کے ہاں مجرور پڑھنا قبیح ہے، لیکن انہوں نے قبح کی علت بیان نہیں کی، جبکہ سیبویہ فرماتے ہیں کہ: ضمیر مجرور پر عطف ناجائز ہے، اِس لیے کہ ضمیر مجرور تنوین کی طرح کلمہ کا جز ہوتا ہے۔

اِس عبارت سے معلوم ہوگیا، کہ قاضی بیضاویؒ کا قول تمام محققین نحاۃ کا بھی ہے۔

علمِ فقہ

تفسیر بیضاوی میں فقہی مباحث کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ قاضی بہت بڑے فقیہ بھی تھے، اور اِس کی دلیل قاضی بیضاویؒ کی علمِ فقہ میں مایہ ناز کتاب الغاية القصوى في دراية الفتوى (۱۰) ہے۔

تفسیر بیضاوی میں قاضیؒ آیات الاحکام کی تفسیر کرتے ہوئے فقہ شافعی کو ترجیح دیتے ہیں، اپنے مذہب کے دلائل ذکر کرنے کے بعد اکثر مخالفین کے دلائل سے صرفِ نظر کرتے ہیں، یا پھر ان کو ذکر کرنے کے بعد ان پر رد کرتے ہیں، بسم اللہ کی تفسیر میں یہ بحث کرتے ہوئے، کہ بسم اللہ سورفاتحہ کا جز ہے، یا نہیں؟ قاضی بیضاویؒ امام شافعی کے دلائل ذکر کرتے ہیں اور مخالفین کے دلائل کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتے، چنانچہ فرماتے ہیں: ولنا أحاديث كثيرة (۱۱)

حالانکہ امام نوویؒ نے شافعی المسلک ہونے کے باوجود شرح مسلم میں احناف کے دلائل ذکر کرکے ان کے دلائل کی قوت کی طرف اشارہ کیا ہیں، چنانچہ امام نوویؒ اِس حدیث قسمت الصلاة بيني وبين عبدي نصفين (۱۲) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں واحتج القائلون بأن البسملة ليست من الفاتحة بهذا الحديث وهو من أوضح ما احتجوا به (۱۳) جو اِس بات کے قائل ہیں، کہ بسم اللہ سورفاتحہ کا جز نہیں ہے، وہ اِس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور یہ ان کے دلائل میں سب سے واضح اور قوی دلیل ہے۔

علمِ کلام

قاضی بیضاویؒ علم کلام کے میدان میں ایک ماہر شہسوار کی طرح تھے، بلکہ آپ کو علمِ کلام میں استاد کی حیثیت حاصل تھی، اور اِس کی دلیل آپ کی کتابیں طوالع الانوار (۱۴) اور مصباح الارواح (۱۵) ہیں، قاضیؒ نے اپنی تفسیر میں مختلف مواقع پر علم کلام کے مباحث کو انتہائی شائستگی سے بیان کئے ہیں، حاجی خلیفہؒ آپ کے متعلق فرماتے ہیں

ولكونه متبحرا في ميدان فرسان الكلام فأظهر مهارته في العلوم حسبما يليق بالمقام (۱۶)

آپ چونکہ علمِ کلام کے شہسواروں میں سے تھے، اِس لیے آپ مختلف علوم میں موقع کی مناسبت سے کلامی مہارتیں بیان کرتے ہیں۔

آپ مسائل کلامیہ میں اشاعرہ کا مسلک اختیار کرتے ہیں، چنانچہ بِسۡمِ اللّٰہِ کی تفسیر میں الرَّحۡمٰنِ اور الرَّحِیۡمِ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

والرحمة فی اللغة: رقة القلب، وأسما اللّٰہ تعالی إنما تؤخذ باعتبار الغایات التی هی أفعال دون المبادی التی تکون انفعالات(۱۷)

رحمت کا معنی رقتِ قلب ہے، اور اللہ تعالی کے اسما سے آثار اور نتائج مراد ہوتے ہیں، جو کہ افعال یعنی مؤثر ہونے کے معنی میں ہیں، اِن کا ابتدائی معنی مراد نہیں ہوتا، اِس لیے کہ اس میں انفعالی یعنی متأثر ہونے کا معنی ہوتا ہے۔

یہ ایک ضابطہ بیان کیا، کہ اللہ تعالی پر ایسے تمام اطلاقات جو انفعال کے معنی کو مستلزم ہوتے ہیں، یا اِن کا اللہ تعالی کے ساتھ اتصاف درست نہ ہو، جیسے رحمت، غضب، حیاء اور استہزاء وغیرہ، تو ان کے آثار اور نتائج مراد ہوں گے، مثلاً رحمت کا معنی تو رقتِ قلب ہے، جو اللہ تعالی کے مناسب نہیں ہے، لیکن اِس کا اثر خیر پہنچانا ہے، اور یہ معنی اللہ تعالی کے مناسب ہے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالی کے اِس قول اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۸) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں یجازیهم علی استهزائهم، سمی جزاء الاستهزاء باسمه کما سمی جزا السیئة سیئة(۱۹) جو چیز اللہ تعالی کی طرف منسوب ہے، وہ نفسِ استہزا نہیں ہے، بلکہ استہزا کی سزا ہے۔ استہزا کی سزا کو مجازاً ''استہزا'' کہا گیا، جیسے قرآن مجید میں گناہ کے بدلے کو بھی سیئہ کہا گیا ہے۔

ایک جگہ اللہ تعالی کی صفتِ کلام کے بارے میں اشاعرہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں

قیل إنه لما نودی قال: من المتکلم قال: إنی أنا اللّٰہ، فوسوس إلیه إبلیس لعلک تسمع کلام شیطان فقال: أنا عرفت أنه کلام اللّٰہ بأنی أسمعه من جمیع الجهات وبجمیع الأعضا. وهو إشارة إلی أنه علیه الصلاة والسلام تلقی من ربه کلامه تلقیا روحانیا(۲۰)

جب موسیٰ کو آواز دی گئی، تو آپؑ نے پوچھا کہ: کہنے والا کون ہے؟ تو اللہ تعالی نے فرمایا: میں ہوں، اِس پر ابلیس نے دل میں وسوسہ ڈالا، کہ شاید آپ نے شیطان کا کلام سنا ہو، تو موسی نے جواب دیا کہ: میں جانتا ہوں کہ یہ اللہ تعالی کا کلام ہے، اِس لیے کہ میں نے یہ آواز تمام جہات سے اور تمام اعضا کے ساتھ سنی، یہ اِس بات کی دلیل ہے، کہ آپ نے اپنے رب کا کلام معنوی اور روحانی طور پر سنی تھی اور یہ اِس بات کی طرف بھی اشارہ ہے، کہ اللہ تعالی کا کلام حروف اور اصوات کے قبیل سے نہیں ہے۔

اور یہی مسلک اپنی کتاب طوالع الأنوار میں بھی بیان کیا ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں وکلامه لیس بحرف ولا صوت یقوم بذاته تعالی خلافا للحنابلة والکرامیة(۲۱)

علمِ لغت

تفسیر بیضاوی کا مطالعہ کرتے وقت یہ اندازہ لگانا مشکل ہے، کہ قاضی بیضاویؒ مفسر ہے یا لغوی! تفسیرِ بیضاوی میں قاضیؒ

لغوی ابحاث ایسے تحقیق کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، کہ گویا تفسیر بیضاوی لغت کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتا ہے، اللہ تعالی کے قول وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲۲) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں وأنفق الشيء وأنفده أخوان، ولو استقريت الألفاظ وجدت كل ما فاؤه نون وعينه فاء دالا على معنى الذهاب والخروج (۲۳) أنفق اور أنفديه دونوں نظریں ہیں، یعنی اِن کے درمیان اشتقاق اکبر (۲۴) ہے، پھر ایک ضابطہ بیان کیا، کہ اگر کلامِ عرب کی جستجو کی جائے، تو یہ بات معلوم ہوگی، کہ ہر وہ لفظ جس کا فاء کلمہ نون اور عین کلمہ فاء ہو، تو وہ ذہاب اور خروج کے معنی پر دلالت کرے گا۔

علم التصوف

قاضی بیضاویؒ بہت بڑے صوفی بھی تھے، اور اپنی تفسیر میں جگہ جگہ تصوف کے مسائل کی طرف اشارہ بھی کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالی کے قول إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۲۵) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

بنى أول الكلام على ما هو مبادى حال العارف من الذكر والفكر والتأمل فى أسمائه والنظر فى آلائه والاستدلال بصنائعه عل عظيم شأنه وباهر سلطانه، ثم قفى بما هو منتهى أمره وهو أن يخوض لجة الوصول ويصير من أهل المشاهدة فيراه عياناويناجيه شفاها (۲۶)

اِس عبارت میں غائب کے صیغے سے حاضر کی طرف انتقال کا نکتہ بیان کرتے ہوئے عارف کے حال کا مبداء اور منتہی بیان کیا یعنی عارف کے لیے ابتداء ضروری ہے، کہ وہ ذکر اللہ پر مداومت کرے، اس کے اسماحسنی اور صفات میں تفکر کرے اور اس کی نعمتوں میں غور وفکر کرے، اور اس کی کاریگری سے اس کی عظمتِ شان اور غالب بادشاہت پر استدلال کرے، پھر ترقی کرتے ہوئے تمام ماوراء چیزوں سے منقطع ہوکر ذاتِ مقدسہ میں یوں مستغرق ہوجائے کہ اہلِ مشاہدہ میں سے ہوجائے، جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، اور اس سے سرگوشی کررہا ہے۔

اِسی آیت میں آگے جاکر مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں فإن العارف إنما يحق وصولها إذا استغرق فى ملاحظة جناب القدس وغاب عما عداه، حتى إنه لا يلاحظ نفسه ولا حالا من أحوالها إلا من حيث إنها ملاحظة له ومنتسبة إليه (۲۷) عارف کا وصول الی اللہ تب ثابت ہوتا ہے، جب وہ ذاتِ مقدسہ میں ایسے مستغرق ہوجائے، کہ اللہ تعالی کے ماسوا سے منقطع ہوجائے، یہاں تک کہ جب وہ اپنے نفس یا نفس کے احوال میں سے جس کا بھی ملاحظہ کرے، تو یہ حقیقت میں اللہ تعالی کا ملاحظہ ہو۔

علم القراءت

قاضی بیضاویؒ علم القراءت کے بھی ماہر تھے، اور آپؒ کی یہ مہارت تفسیرِ بیضاوی میں جگہ جگہ عیاں ہے، آپؒ ایسی مہارت اور آسان فہم انداز سے قراءت کا بحث کرتے ہیں، کہ بڑے بڑے قاری حیران رہ جاتے ہیں، قراءت کی بحث میں راجح اور مرجوح کی نشان دہی کرکے قاری سے اپنی مہارت کا سکہ منواتے ہیں۔ اللہ تعالی کے قول أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۸) میں قراءتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

وقرئ أأنذرتهم بتحقيق الهمزتين وتخفيف الثانى بين بين، وقلبها ألفا وهو لحن لأن المتحركة لا تقلب، ولأنه

يؤدى إلى جمع الساكنين على غير حده، وبتوسيط ألف بينهما محققتين، وبتوسيطها والثانية بين بين وبحذف الاستفهامية، وبحذفها وإلقاء حركتها على الساكن قبلها(۲۹)

اِس عبارت میں قاضیؒ نے مختلف قراتیں بیان کی ہیں

☆ دونوں ہمزوں کو باقی رکھا جائے۔

☆ پہلے ہمزہ کو باقی رکھا جائے، اور دوسرے میں تسہیل ہو۔

☆ ہمزہ اولیٰ کو باقی رکھا جائے، اور دوسرے کو الف سے تبدیل کیا جائے، لیکن قاضیؒ فرماتے ہیں یہ قراءت غلط ہے(۳۰)

☆ دونوں کو باقی رکھا جائے، لیکن دونوں کے درمیان الف پڑھا جائے۔

☆ ہمزہ اولیٰ کو باقی رکھا جائے، اور دوسرے میں تسہیل ہو، لیکن دونوں کے درمیان الف پڑھا جائے۔

☆ پہلے ہمزہ کو حذف کیا جائے۔

☆ پہلے ہمزہ کو حذف کیا جائے، لیکن اُس کی حرکت ماقبل حرفِ ساکن کو دیا جائے۔

یہ تفسیرِ بیضاوی میں ذکر کردہ علوم میں سے بعض کا مختصر تذکرہ تھا، اِس مختصر مضمون میں تمام علوم پر تفصیلی تذکرہ مشکل ہے۔ البتہ کسی دوسرے مضمون میں بقیہ علوم کا تذکرہ کیا جائے گا، اِس مضمون سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں:

☆ تفسیرِ بیضاوی تقریباً تمام علومِ نقلیہ وعقلیہ کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆ علمِ نحو میں قاضی بیضاویؒ عموماً بصریین کا مسلک اختیار کرتے ہیں۔

☆ علمِ فقہ میں قاضی بیضاویؒ امام شافعی کے مسلک کو ترجیح دیتے ہیں۔

☆ کلامی مباحث ذکر کرتے ہوئے اشاعرہ کے مسلک کو بڑے مدلل انداز سے ذکر کرنے کے بعد اس کو راجح قرار دیتے ہیں۔

☆ قراءتوں کا بیان کرتے ہوئے قولِ ضعیف کی نشان دہی کرتے ہیں۔

☆ کبھی کسی آیت کی ظاہری تفسیر ذکر کرکے اِس آیت کے باطنی اسرار اور رموز کو بھی بیان کرتے ہیں۔

مصادر ومراجع

(۱) حاجی خلیفہ، مصطفیٰ بن عبداللّٰہ، کشف الظنون، داراحیا التراث العربی، ج ۱ ص ۱۸۶ (۲) زرکلی، خیرالدین بن محمود الدمشقی، الاعلام، دارالعلم للملایین، بیروت، ج ۴ ص ۱۱۰ (۳) بیضاوی، ناصرالدین عبداللّٰہ بن عمر، تفسیر بیضاوی، دار احیاء التراث العربی، بیروت ج ۱ ص ۲۵ (۴) البقرۃ: ۶ (۵) تفسیر بیضاوی، ج ۱ ص ۴۱ (۶) ایضاً (۷) النساء: ۱ (۸) تفسیر بیضاوی، ج ۲ ص ۵۸ (۹) النحاس، ابوجعفر احمد بن محمد النحوی، اعراب القرآن، دار الکتاب العلمیۃ، بیروت، ج ۱ ص ۱۹۷ (۱۰) یہ کتاب دارالبشائر، بیروت سے دو جلدوں میں ڈاکٹر علی محیی الدین کی تحقیق کے ساتھ ۱۴۲۹ھ میں شائع ہوئی ہے، یہ کتاب دراصل امام غزالی کی الوسیط کا اختصار ہے، قاضیؒ نے اِس میں

فقہ شافعی میں قولِ راجح کو بڑے مدلل انداز سے پیش کیا ہے، اِس کتاب کی خصوصیت یہ ہے، کہ اِس میں انتہائی اختصار کے ساتھ فقہ شافعی کا فقہ حنفی اور مالکی کے ساتھ مقارنہ بھی کیا گیا ہے، قاضیؒ نے اِس کتاب میں آیات الأحکام اور أحادیث الأحکام کو بھی جمع کیا ہیں (۱۱) تفسیر بیضاوی، ج ا ص ۵۲ (۱۲) امام مسلم، ابوالحسن بن الحجاج نیساپوری، صحیح مسلم، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ج ا ص ۲۹۶، رقم: ۳۹۵ (۱۳) نووی، ابوزکریا یحییٰ بن شرف، شرح مسلم، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ج ۴ ص ۱۰۳ (۱۴) یہ کتاب دار الجیل، بیروت اور المکتبۃ الازھریۃ، قاھرہ سے عباس سلیمان کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی ہے، اِس میں قاضیؒ نے علمِ کلام کے مشکل مباحث کو اشاعرہ کے مسلک کے مطابق انتہائی اختصار کے ساتھ وضاحت کر کے لکھی ہیں، علامہ تاج الدین سبکیؒ اِس کتاب کے متعلق فرماتے ہیں: یہ کتاب میرے نزدیک علم کلام کی عظیم اور مختصر تالیف ہے، اِس کتاب کے بہت سارے شروحات اور حواشی ہیں، لیکن ان میں سب سے عظیم شرح علامہ شمس الدین اصفہانی نے لکھی ہیں، جو الگ سے بھی شائع ہوئی ہے (۱۵) یہ کتاب دار الرازی، عمان اردن سے سعید فودۃ کی تحقیق کے ساتھ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی ہے، یہ کتاب دراصل قاضی بیضاویؒ کی کتاب طوالع الانوار کا خلاصہ ہے، اِس میں قاضیؒ نے علم کلام کو منطقی انداز میں بیان کیا ہیں، اِس لیے اِس کتاب کے محقق سعید فودۃ فرماتے ہیں کہ: میرے نزدیک یہ کتاب منطق اور علم کلام کے طلبہ کو درساً پڑھانی چاہیے، تاکہ بیک وقت وہ دونوں علوم سیکھ سکے، اِس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر علامہ اصفہانی نے طوالع الانوار کی طرح اِس کی بھی شرح لکھی ہیں (۱۶) کشف الظنون، ج ا ص ۱۸۶ (۱۷) تفسیر بیضاوی، ج ا ص ۲۷ (۱۸) البقرۃ: ۱۵ (۱۹) تفسیر بیضاوی، ج ا ص ۴۸ (۲۰) تفسیر بیضاوی، ج ۴ ص ۲۴ (۲۱) بیضاوی، ناصر الدین عبداللہ بن عمر، طوالع الأنوار، المکتبۃ الازھریۃ للتراث، قاھرہ، ص ۱۸۹ (۲۲) البقرۃ: ۳ (۲۳) تفسیر بیضاوی، ج ا ص ۳۹ (۲۴) اشتقاق اکبر کی تعریف یہ ہے، کہ دو کلموں کے معنی میں مناسبت ہو، اور اکثر حروفِ اصلیہ میں اشتراک ہو، اور باقی قریب المخرج ہو (۲۵) الفاتحہ: ۵ (۲۶) تفسیر بیضاوی، ج ا ص ۳۹ (۲۷) ایضاً (۲۸) البقرۃ: ۶ (۲۹) تفسیر بیضاوی، ج ا ص ۴۱ (۳۰) اِس قراءت کے غلط ہونے کی دو وجہیں ہیں ☆ کہ ہمزہ ساکنہ کو حرفِ علت سے تبدیل کیا جاتا ہے، ہمزہ متحرکہ کو نہیں ☆ اگر دوسرے ہمزہ کو الف سے تبدیل کیا جائے، تو التقاء ساکنین علی غیر حدہ لازم آئے گا، اور وہ ناجائز ہے، اِس لیے کہ دوسرا ساکن یعنی نون غیر مدغم ہے، البتہ التقاء ساکنین علی حدہ جائز ہے، یعنی جب دوسرا ساکن مدغم ہو، جیسے وَلَا الضَّالِّین۔

مولانا سجاد الحجابی
دار العلوم نرشک مردان

فن خطابت اور علمی جستجو

بزم شیخ الہند کے عنوان سے گذشتہ سالوں کی طرح امسال بھی معہد الصدیق میں تقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا جس میں معہد کے ہونہار طلبہ نے حصہ لیا، اس عظیم علمی مجلس میں اہل علم حضرات نے بھی شرکت کی، محترم المقام جناب مولانا سجاد الحجابی نے بھی اس مجلس میں شرکت کر کے ایک عالمانہ خطاب سے حاضرین کو محظوظ فرمایا، مذکورہ خطاب افادہ عامہ کی خاطر سہ ماہی الصدیق کے قارئین کے لیے پیش خدمت ہیں۔

میرے محترم بزرگو! اور اس پروقار مجلس میں تشریف فرما معزز علماء کرام اور طلباء عظام:

ہم سب کے لیے یہ بہت خوشی کا موقع ہے کہ الحمد للہ ہر سال جامعہ معہد الصدیق میں حضرت مولانا عبدالرؤف بادشاہ صاحب طلبائے کرام کی ایک مجلس النادی بعنوان ''تقریری مقابلہ'' کے حوالہ سے ایک سنجیدہ مجلس کا انعقاد کرتے ہیں، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جامعہ اپنی ذمہ داریاں پوری طرح نبھا رہی ہیں، اور یہی مقصد مطلوب ہے کہ والدین اپنے بچے اس لیے مدارس میں داخل کرواتے ہیں کہ یہ ضائع نہ ہو اور معاشرے کے لیے مستقبل میں بہترین انسان اور امن کا پیچان بنیں لہٰذا یہ پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے یہ نونہال بچے آنے والے پرفتن زمانے میں معاشرے کے لیے اصلاح کا ذریعہ بنے۔

مقام خطابت

امر واقع یہ ہے کہ ایک عالمِ دین کے لئے تقریر و لیکچر دینا بہت بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ابھی سے جس طالب علم کو تقریر کا گر نہ آتا ہو اور فنِ خطابت میں اپنی صلاحیت کو بروئے کار نہ لائے، اگر چہ وہ کتنا ہی بڑا عالم ہو در حقیقت اس کا علم بہت سی اہم مواقع میں مخفی رہ جاتا ہے، اور جو ابھی سے فن خطابت میں محنت کریں تو آنے والے دنوں میں اس عالم دین کے ذریعے ہزاروں لوگ بدعات، شرکیات اور غلط عقائد سے محفوظ رہ سکتے ہیں، ان کے ذہن اسلام سے وابستہ اور اس عالم دین کے کلمہ خیر کی وجہ وہ تادم مرگ اسلام سے مضبوط وابستہ رہتے ہیں، اگر چہ اسے کسی بھی سیکولرازم، کمیونزم اور باطل قوتوں کے درمیان رہنا پڑے، بلکہ ان لوگوں کے ذہن کبھی بھی اضطراب کے شکار نہیں ہوتے، اس لئے کہ ان کا تعلق ایک ایسے مستند باعمل عالم دین کے ساتھ ہوتا ہے کہ برسوں پہلے اس نے اپنے خطاب اور کلمہ خیر کے ذریعے ان لوگوں کا ذہنی تربیت کیا ہوا ہوتا ہے، جس بات کو آپ ۲۰ سال میں اس کو نہیں سمجھا سکتا، ایک اچھا مقرر کم وقت میں مثبت انداز میں سمجھا لیتا ہے کہ وہ پھر اس بات کو زندگی بھر نہیں بھولے گا اور اس پر باعمل رہے گا، بلکہ بہت سے خرافات اور بدعات سے محفوظ ہو جائے گا

الغرض کہ تقریر وخطابت کی صلاحیت طالب علم کے لیے ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ عوام میں دین کا کام کرلے، تو آپ کو چاہیے کہ عوام کے سامنے سلجھے ہوئے انداز میں اچھے طریقے سے القاء الکلمہ، محاضرہ سیکھے، بندہ پچھلے دنوں ایک پروگرام کے سلسلے میں نوشہرہ گیا تھا، ایک مخلص ساتھی نے مجھے یہ بات بتائی کہ ہمیں حضرت مولانا ڈاکٹر شیخ شیر علی شاہ صاحبؒ کے خاص شاگرد نے یہ کہا کہ میں نے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کو خواب میں دیکھا تو میں نے ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری بخشش فرمادی اور سب سے زیادہ فائدہ مجھے عوامی خطابات وتقاریر نے دیا، تقریر کی صلاحیت پیدا کرنا یہ بہت بنیادی چیز ہے الحمدللہ اسلام کی تاریخ خطباء سے بھری پڑی ہے، اسلام نے ہر دور میں قوم کو بڑے بڑے خطباء سے نوازا ہے، امام فخر الدین رازیؒ، امام ابن الجوزیؒ جن کے ایک خطاب میں ہزاروں لوگ سننے کے لیے بیٹھتے اور ان کے زندگیوں میں انقلاب آجاتا، عطاء بن موصل عرب کا بہت بہترین خطیب تھا ان کے تقاریر فصاحت وبلاغت سے بھرے ہوتے تھے لیکن اس کی زبان میں لکنت تھی اور لفظِ راء کو نہیں پڑھ سکتے تھے تو انہوں نے اپنے طویل طویل خطابات میں لفظ راء کا استعمال نہیں کیا بلکہ جب بھی تقریر میں لفظ راء کا آجاتا تو برجستہ دوسرے مترادف استعمال کردیتے، جیسے شاعر کی جگہ قمح، مطر کی جگہ غیث استعمال کرلیتے اور یوں اپنے فصاحت وبلاغت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی کمزوری کو نرالے انداز میں چھپالیتے تھے۔

میدان خطابت کے شہسوار

جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں واصل بن عطاء کے کئی کئی صفحات پر مشتمل تقاریر نقل کئے ہیں اور اس میں آپ لفظ راء نہیں پائیں گے، مولانا ابوالکلام آزاد (جو سیاست کا ایک بہترین شہسوار تھا) ان کی بہت سی صلاحیتوں میں اہم صلاحیت ان کی پرزور تقریر ہوتی تھی اور تقریر کی بنیاد پر سیاست کے میدان میں صف اول میں کھڑے تھے، جب وہ کانگریس اور جمعیت علماء ہند کی طرف سے خطاب کرتے تو گویا کہ اس مجلس میں آگ لگادیتے، خون گرمادیتے، ۱۹۴۷ کو جب مملکت خداداد پاکستان آزاد ہوا تو ان کی خواہش تھی کہ مسلمان بھارت سے نہ جائے، چنانچہ لاکھوں مسلمان ان کے تقاریر کی وجہ سے بھارت میں رہ گئے اور اس کا یہ فائدہ ہوا کہ آج الحمدللہ ہمارا ملک بھی آزاد ہے، اور بھارت میں بھی کروڑوں مسلمان اپنے دین اسلام کے ساتھ رہ رہے ہیں اور جس طرح پاکستان میں بڑے بڑے جامعات ہیں تو ہمارے اکثر مدارس یہاں کے بنسبت بھارت میں زیادہ ہیں، جیسے مظاہر العلوم سہارن پور، دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مرادآباد، مدرسہ ڈابھیل، ندوۃ العلماء لکھنو وغیرہ وغیرہ ان بڑے بڑے جامعات کے بقاء میں مسلمان رہنماؤں کی تقاریر کا کردار شامل ہے، آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ الحمدللہ بھارت میں بھی اسلام زندہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جس کے پاس تقریر کی صلاحیت ہو وہ دین اسلام کی خدمت احسن طریقے سے کرسکتا، البتہ تقریر سے پہلے چند باتیں جاننا مناسب ہے، جس کا میں ذکر کردیتا ہوں:

اپنے باطن کی اصلاح امر اول ہے

تقریر کے دوران مجلس کا لحاظ رکھنا، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے تھے، کہ حق بات کو حق طریقے سے کیا جائے، تو اس کا بلاشبہ اثر ہوتا ہے۔

مقرر کے لیے ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کا اپنے باطن پر نظر ہو، اور اس کی اصلاح مقصود ہو ایسا نہیں کہ لوگوں میں تو وہ مشہور خطیب بن جائے، لیکن اس کا باطن برباد ہو، لہٰذا ایسے تقریر کا فائدہ دس منٹ ہوتا ہے، کہاوت ہے ''از دل خیزد بر دل ریزد'' جب بات دل سے نکلتی ہے، تو اس کا اثر دل ہی پر ہوتا ہے۔

آج برصغیر میں جو دین پھیلا ہوا ہے اس میں بنیادی عنصر اکابر کی تقریریں ہیں، یہ اکابر بہت نرم انداز لیکن دلنشین بیان کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے، جیسے شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ، شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب جب بیان فرماتے ہیں تو بہت ہی آرام اور دھیمے انداز سے بولتے ہیں بے جا جوش اور چیخیں بلند کرنا ان کا وطیرہ نہیں ہے، لہٰذا اس کا اثر مخاطب پر اتنا ہوتا ہے کہ ان کی باتیں دل میں بیٹھ جاتے ہیں۔

بندہ دو سال قبل تبلیغی اجتماع میں گیا تھا، اور ہندوستان کے علماء اور سب اکابر کے تقاریر کو غور سننے کے بعد جب واپس ہوا، تو ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا کہ کس کی تقریر اچھی تھی؟ میں نے کہا کہ میں حاجی عبدالوہاب صاحب کی تقریر سے بہت متاثر ہوا، سب سے اعلیٰ بیان ان کا تھا، نہ کوئی جذباتی تقریر، نہ کوئی خاص انداز اور نہ کوئی جداگانہ اسلوب، لیکن وہ ہر بات دل سے کہتا تھا، خدا کی قسم ان کی ایک ایک بات میرے دل میں اتر جاتی، تو میں نے مدرسہ رائیونڈ کے استاذ حدیث مولانا عمر صاحب سے عرض کیا کہ اس شخص کی تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ اس بیان کے پیچھے ۶۰۔۷۰ سال کی دینی قربانیوں کی تاریخ ہیں اور پھر مجھے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ جب مولانا الیاسؒ میوات میں تبلیغ کی ابتدائی محنت کرتے تھے، تو حاجی عبدالوہاب صاحب کو اپنے ساتھ لگایا تھا اور انہیں یہ کام سپرد کیا تھا کہ مسجد میں میرے ساتھ بیٹھ کر نمازیوں سے دعوتِ دین کی بات کرنا، اس دوران ایک شخص نماز پڑھ کر واپس ہوا اور مجھے خیال نہ رہا، اچانک مولانا الیاسؒ نے درد بھرے لہجے میں فرمایا کہ وہ آدمی واپس چلا گیا، میں برہنہ پاؤں مسجد سے نکلا اور اس آدمی کے ساتھ چلتا ہوا راستہ میں دعوت دین کی بات کر رہا تھا ایسے میں ہم اتنے دور چلے گئے کہ واپسی پر کافی راستہ برہنہ پاؤں مسجد تک طے کرنا پڑا، تو مولانا عمر صاحب نے مجھے کہا کہ یہ وہی قربانیاں ہیں جو ان باتوں کے پیچھے کھڑی ہیں، لہٰذا میری عرض یہ ہے کہ خطیب کا باطن اعلیٰ ہونا چاہیے خطیب اپنے دل میں ہمیشہ یہ محاسبہ کرے کہ اے اللہ! ان باتوں کا سب سے پہلے میں محتاج ہوں اور پھر میرے یہ بھائی محتاج ہیں، اے اللہ! پہلے مجھے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما اور پھر میرے مخاطبین کو، پھر دیکھنا کہ مخاطبین پر ان باتوں کا کتنا اثر ہوتا ہے پس اندرونی اصلاح سب سے لازمی چیز ہے۔

ایک موثوق راوی نے مجھے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی دامت برکاتہم کے زبانی یہ واقعہ بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھ پر اور میرے بھائی مفتی تقی عثمانی صاحب پر ہمارے مرشد حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ کی طرف سے دس سال مسلسل اصلاحی تقریر کی پابندی تھی، اور جمعہ کی تقریر کی بھی اجازت نہیں، یہ عرصہ مکمل کرنے کے بعد تقریر کی اجازت مرحمت فرمائی اور دونوں بھائیوں کو بلا کر ڈاکٹر صاحب نے خطوط دکھلائے جو مدینہ منورہ سے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ نے ہمارے بارے میں ڈاکٹر صاحب کو تحریر کیے تھے اور ان خطوط میں یہ تھا کہ مفتی شفیع رحمہ اللہ کے ان دونوں بیٹوں سے کہیں صاحبزادے نہ بن جائیں ان کی خوب اصلاح کرنا۔

رسوخِ علم مطلوب ہے

ایک اور بات جو ضروری سمجھتا ہوں کہ تقریر وخطابت کے پیچھے مضبوط علم کی قوت ضروری ہے آج کل ہم بہت سارے ساتھی دیکھتے ہیں جو تقریر سطحی کتابوں سے تیار کرتے ہیں میں ایک مکتبے میں بیٹھا ہوا تھا ایک معتبر ساتھی نے آکر وعظ کی ایک سطحی کتاب کا پوچھا اور مجھے کہا کہ جلدی میں اس کتاب سے تقریر تیار کرتا ہوں مجھے بہت افسوس ہوا کہ ایک مستند عالم کو اپنی تقریر کم از کم الترغیب والترھیب للمنذری، فتح الباری، عمدۃ القاری، خطبات حکیم الامت سے تیار کرنا چاہیے۔ چاہیے کہ تمہارے سامنے شریعت کے یہ تمام ابواب ہو تو تم ان کے مصادر ومراجع دیکھ کر ان سے ایک اچھا تقریر بنالو، جب تقریر کے پیچھے علمی قوت نہ ہو، تو یہی حال ہوگا، کہ مخاطب متاثر نہیں ہوگا۔

الغرض علم میں رسوخ بھی ضروری ہے ہمارے اکابرین نے یہ جو درس نظامی مقرر کی ہے، اس کے پڑھنے میں سستی نہیں کرنی چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ درس نظامی کی ہر کتاب اپنی جگہ بہترین کتاب ہے بندہ نے بہت سے مکالموں میں حصہ لیا ہے لیکن میں اس کے باوجود اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ہمارے اکابر نے یہ جو درس نظامی مقرر کی ہے لاجواب ہے، اکابر نے ہر ایسے کتاب کو داخل درس کیا ہے جو مشکل بھی ہو، لیکن ساتھ ساتھ مخدوم بھی ہو، میں نے بخاری شریف کے شروح پر لکھی گئی ایک کتاب دیکھی، اس میں بخاری شریف کے شروح کی تعداد ۳۰۰ سے زائد تھی اسی لیے تو بخاری شریف کو نصاب میں رکھا گیا ہے اور یہی حال تقریباً درس نظامی کی ہر کتاب کا ہے۔

شرح العقائد شیخ سعید فودہ کی نظر میں

چند دن پہلے اردن کے ایک بڑے عالم، علم الکلام کے ماہر، شیخ سعید عبداللطیف فودۃ اکا ایک انٹرویو سن رہا تھا، تو کسی نے ان سے پوچھا کہ ہمیں علم الکلام کے کونسے کتب دیکھنے چاہیے؟ تو انہوں نے درجہ بہ درجہ ترتیب وار مختلف کتابوں میں شرح العقائد للنسفی ک ابھی تذکرہ کیا کہ اس کتاب میں دقت کے باوجود علم الکلام کے نہایت اہم نکتے درج ہیں، میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے اکابر پچھلے ۸ سو سال سے اس کتاب کو داخل درس کیا ہے اور درس نظامی میں بھی داخل درس ہے، مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ ایک عرب عالم اس کتاب کی تعریف کر رہا ہے اور برصغیر میں بہت سارے حضرات اس کتاب کو درس نظامی سے نکال دینا چاہتے ہیں اور آسانی سے اس کتاب پر یہ فتویٰ کس لیتے ہیں کہ اس میں فلسفہ اور منطق ہے عقائد نام کی کوئی چیز نہیں ہے، حالانکہ اگر درست طریقے سے محنت کے ساتھ اس کتاب کو پڑھا جائے تو طالب علم عقیدہ میں مضبوط بن جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو اس کتاب کو پڑھا نہیں سکتے وہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کو نکالنا چاہیے کچھ عرصہ پہلے اللہ پاک نے عمرہ کی توفیق عطا فرمائی، مکہ مکرمہ میں دارالعلوم دیوبند سے آئے ہوئے وہاں کے دارالافتاء کے استاد ونائب مفتی، مفتی زین الاسلام صاحب سے ملاقات ونشست رہی، ان کی فراغت ۱۹۷۵ کی تھی، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا اب بھی وہاں بھارت میں معقولات کی اونچی کتابیں قاضی مبارک، حمداللہ، ملا حسن، توضیح تلویح اور شرح العقائد للنسفی پڑھائی جاتی ہے تو انہوں جواباً فرمایا کہ ابھی کتابیں نہ رہی، میں نے کہا کہ کیا وجہ ہے؟ تو فرمایا کہ اب پڑھانے والے نہ رہے۔

تاسف کی بات یہ ہے کہ یہ کتابیں تو ہماری ضرورت ہے، ہماری روح کو غذا بخشتی ہے، ہمارے علم کو مضبوط بناتی ہے اور انہی کتابوں کو ہم نے پیچھے چھوڑا ہے، میں تو اپنے تجربات بیان کرتا ہوں میرا علم کم ہے، یہ سارے ساتھی مجھ سے علم میں زیادہ ہے، البتہ میں نے تم سے طالب علمی میں وقت زیادہ گزارا ہے میں تو کوئی بڑا عالم نہیں ہوں، علماء تشریف فرما ہیں، کچھ عرصہ سے شرح عقائد کا حاشیہ خیالی پڑھا رہا ہوں، ایک دن میں اردو بازار لاہور گیا تھا وہاں ایک دکان دار سے خیالی کی کسی تقریر کا استفسار کیا تو کہنے لگا کہ کافی عرصہ کے بعد کوئی خیالی کے متعلق پوچھ رہا ہے، کیونکہ یہ کتابیں تو پہلے ہوا کرتی تھی اب نہیں ہے۔

میرے طالب علم بھائی! اپنے علم کو مضبوطی سے حاصل کروں، تقوی وعمل کے ساتھ حاصل کرو، پھر آپ کو تقریر کے لیے سطحی خطبات کی ضرورت ہی نہیں ہوگی البتہ حضرت تھانویؒ کے خطبات کو ضرور پڑھیں کہ وہ علم سے بھرے ہوئے ہیں چند دن پہلے ہی کی بات ہے کہ میں دین ودنیا کے موضوع پر ان کے تین تقاریر کا مجموعہ دیکھ رہا تھا اور تکمیل ودرجہ سادسہ کے طلباء کو سنایا اس میں علم کلام کی جو بحث حضرت تھانویؒ نے کی ہمیں حیران کر دیا، ایسی بحث تھی کہ اس سے تمام مشکل حل ہو گئے، اور تقریر بھی عوامی تھی، واقعی وہ وہبی علوم والا انسان تھا اگر کوئی ان کے خطبات دیکھتا ہو، تو یہ مناسب ہے، لیکن عموماً اپنے مستوی کو نیچا نہ رکھنا چاہیے، اپنے مستوی کو اعلی رکھو۔

اسلامی قلمی ورثہ کی اہمیت

ایک اور درخواست یہ ہے کہ اپنا دائرہ کار تقریر میں محصور مت سمجھو، کوشش کرو کہ تم بہترین مدرس بنو، بہترین محقق، ریسرچ سکالر بنو، کہ تم کتاب پر تحقیق کر سکو، کیونکہ آج الحمدللہ پوری دنیا میں تقریباً ایک کروڑ اسلامی کتابیں مخطوطات کی شکل میں پائی جاتی ہے جن پر تحقیق کی ضرورت ہے، ان کتابوں میں صرف ۸، ۱۰ لاکھ کتابیں چھپی ہیں باقی نوے لاکھ کتابیں قلمی ہیں اس کے لیے محققین کی ضرورت ہے، کہ عالم اسلام کا نام روشن ہو جائے، اور یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ ان میں سے بیشتر مخطوطات یورپی ممالک کے لائبریریوں کی زینت ہیں، امریکہ کی برنسٹن یونیورسٹی کے لائبریری قلمی کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اس کا فہرست حال ہی میں صرف دس جلد میں چھپا ہے، یہ صرف ان کتب کا فہرست ہے جو امریکہ کے ایک یونیورسٹی میں موجود ہیں۔

ایک مشہور محقق اور عالم گزرے ہیں علامہ بیری زادہؒ کے نام سے پہنچانے جاتے ہیں، اس فہرست میں ان کی انچاس کتابوں کے نادر مخطوطے برسٹن کی کتب خانے میں موجود ہیں جن میں بیشتر تا حال نہیں چھپے، فرنگیوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے، کہ ہم اسلامی دنیا کی ذخیرہ کتب کو ان سے حاصل کریں، کبھی چوری کر کے، کبھی ایک بڑے عالم دین کا وفات ہوا اور ان کے اولاد میں صلاحیت نہ تھی، تو فرنگیوں کے ایجنٹ چلے جاتے اور ان کے اولاد سے وہ کتابیں خرید لیتے اس طریقے سے ہزاروں قیمتی مخطوطات فرنگیوں کے ہاتھ لگ گئے، حقیقت یہ ہے کہ فرنگی بہت مکار ہیں صرف فلسطین ہی کی مثال لیجئے ایک محقق کے تحقیق کے مطابق ۱۹۴۸ء میں بیت المقدس میں (جب مقبوض نہ تھا) تو اسلامی کتب کی تعداد ۵۰۰۰۰ مخطوطے تھی، یاد رہے قلمی کتب کی قیمت بہت ہوتی ہے، یہ مسلمانوں کا ورثہ ہے۔

انگریز اور مخطوطات کی قدردانی

جب ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے مسلمانوں سے بیت المقدس چھین لیا اور ۵۷ اسلامی ممالک کچھ بھی نہ کر سکے، حال یہ ہے

کہ یہودیوں کی تعداد دیڑھ کروڑ سے بھی کم تھی، تو ان کا سب سے پہلے بڑا ہدف یہ تھا کہ فلسطین سے کتابیں نکال سکے، آج ان ۵۰۰۰۰ مخطوطوں میں سے صرف ۸۰۰۰ مخطوطے رہ گئے ہیں اور تقریباً ۴۲۰۰۰ یہودیوں نے چرا لیے اور قدس میں اپنی یونیورسٹی الجامعة العبرية کی زینت بناڈالی۔

اسی طرح بعض کتب امریکا یونیورسٹی میں لے گئے، کچھ جرمنی میں، جرمنی میں برلن کے اندر ایک بڑا کتب خانہ ہے، آپ اندازہ لگائیے کہ مخطوطات کی ان کے پاس اتنی اہمیت ہے کہ جب دوسری جنگ عظیم برپا ہو رہی تھی تو سب سے پہلے ہٹلر نے حکم دیا کہ برلن یونیورسٹی سے یہ کتابیں نکال کر دیہاتوں کی طرف منتقل کردی جائے کیونکہ شہر پر بمباریوں کی وجہ سے کہیں یہ کتابیں ضائع نہ ہو جائے، اس طریقہ سے انہوں نے ان کتب کو محفوظ کر کے جنگ کے بعد واپس برلن مکتبہ میں منتقل کر لیے، ان کی تعداد کافی ہے ان میں نوادرات بھی موجود ہیں، چنانچہ یہ کتب اب چیخ رہے ہیں کہ هل من مبارز کیا کوئی ہے جو ان کتب پر تحقیق کر سکے! جو لوگ اردو شروح کا مطالعہ کرتے ہیں وہ ان کتب پر تحقیق نہیں کر سکتے۔

کتاب سے لگاؤ ہمارے اسلاف کا وطیرہ

میرے دوستو! ہمارے اسلاف نے جو تراث چھوڑا ہے ان کے لیے بیدار مغزی کی ضرورت ہے، علم کو مضبوط تر بنانے کی ضرورت ہے، ہمارے بڑے کتاب کے حل کرنے کے لیے کتنی محنت کرتے تھے، نیز مطالعہ کتنے انہماک سے کرتے تھے آپ اس واقعہ سے خوب اندازہ لگائیے:

ابراہیم حربی جو امام احمد بن حنبلؒ کے شاگرد ہے انہوں نے اتنا بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا کہ گھر میں سب الماریاں بھر گئی، دن رات مطالعہ میں مصروف رہتے، ایک مرتبہ ان پر فاقہ آپڑا، غربت کے مارے کئی دن کھانا میسر نہ ہوا، تو ان کے پاس ان کی بیوی آئی اور کہنے لگی کہ میں نے آپ کے ساتھ کئی دن فاقہ میں گزارے، لیکن میں ان ننھے منھے دو بچیوں کا کیا کروں، میری تھنوں میں دودھ نہیں کہ ان کو دے سکوں، تو ابراہیم حربی نے کتاب سے سر اٹھا کر کہا کہ کہو میں کیا کروں، بیوی نے کہا کہ کچھ کتب فروخت کرلو، تو کام چل جائے گا، تو اس نے کہا کہ ناراض مت ہو یہ کام نہیں کرسکتا اور کہا کہ تھوڑی دیر صبر کرو اللہ تعالیٰ کوئی راہ کھول دے گا اسی دوران بغداد کے بازار میں ایک شخص دو لدے ہوئے اونٹوں کے ساتھ آیا اور بآواز بلند کہہ رہا تھا کہ أين أجد أبراهيم الحربي ؟ وأين داره ؟ تو لوگوں نے کہا کہ أمامك یعنی تھوڑا آگے چلئے! تو ابراہیم حربی کا گھر معلوم کر کے دروازہ کھٹکھٹایا، وہ نکل آئے، اور خیریت پوچھی تو اس پردیسی نے کہا کہ میں بغداد میں خراسان سے آیا ہوں، اور مجھے میرے آقا نے یہ دو اونٹ دیے ہیں اور اس میں آپ کی امانت ہے اور مجھے کہا ہے کہ یہ امانت ابراہیم حربی کے حوالہ کر دینا ہے اور میرا نام نہ لینا، ابراہیم حربی نے کہا کہ میں خراسان میں کوئی نہیں جانتا، یہ امانت کس نے دیا ہے تو اس نے جواب دیا ہے کہ میرے مولا نے نام نہ ظاہر کرنے کا کہا ہے اور یہ دونوں اونٹ ان کے گھر کے صحن میں خالی کر لیے، جب انہوں نے ان بوجھوں کو کھولا تو ان میں بڑے قیمتی کپڑے تھے، اور عورتوں کو کپڑے بہت پسند ہوتے ہیں جب بیوی نے یہ کپڑے دیکھے تو خوشی سے جھوم اٹھی، اور ہر قسم خوراک کی اشیاء ان میں موجود تھی، اور کاغذ اور رقم بھی موجود تھی، اس دور میں کاغذ بڑی قیمتی چیز تھی، اس شخص کو علم تھا کہ یہ کتابوں اور لکھنے کا بڑا عاشق ہے۔

عشق کتب کا ایک انوکھا واقعہ

ابن الخشاب الحنبلی کے حالات ایک مرتبہ دیکھ رہا تھا وہ کتب کا بڑا عاشق تھا، ایک مرتبہ ایک قیمتی کتاب خرید رہے تھے، جس کی قیمت ۵۰۰ درہم تھی، یہ اس وقت بڑی رقم تھی ان کے پاس پیسے نہیں تھے، اور کتاب اٹھالیا، آخر کار ان کا ایک چھوٹا سا گھر تھا تو لوگوں کو جمع کیا کہ میں اس گھر کو فروخت کرنا چاہتا ہوں، کون خریدے گا؟ کتنے داموں میں خریدلو گے؟ لوگوں نے پوچھا کہ کیوں فروخت کررہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ کتاب خریدا ہے اور رقم نہیں ہے کہ ان کو دے سکوں، تو اپنے گھر کو فروخت کر کے کتاب کا رقم ادا کردیا، یہ ہے عشق، ہمیں علمی دنیا میں اس طرح عاشقوں کی ضرورت ہے جو کتاب سے عشق کرے، اور سب سے اعلیٰ مال کو کتاب پر قربان کرے۔

بھائیو! تم اس کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھو، علمی صلاحیت کو مضبوط بناؤ، اپنے آپ کو کتابوں کے لیے تھکا دو، العلم لایعطیک بعضه حتی تعطیک کلک ،علم تم کو اس وقت تک ذرہ بھی نہیں دے گا، جب تک تم نے ان کو ساری زندگی نہ دی ہو، اور اگر تم یہ کہہ رہے ہو کہ رات کو نیند آئے تو چادر اوڑھ کر سو جائے اور یہ کہہ دے کہ علم درپیش است، کہ اللہ کے بہت خزانے ہیں وہ علم دے گا، تو ان باتوں سے علم نہیں ملتا، جیسا کہ علم کے لیے تقوی بہت ضروری ہے، اور تقوی بھی ہم میں موجود نہیں ہوتی۔

محنت، تقوی اور خدمت

محنت اور تقویٰ کے ساتھ مدرسے کی خدمت بھی بہت اہم ہے، خدمت کرنے والے کو علم نصیب ہوتا ہے، لاہور میں ایک بڑا بزرگ گزرا ہے حضرت سید نفیس شاہ حسینیؒ وہ فرماتے تھے کہ کہ اللہ تعالیٰ دو باتوں سے ملتا ہے خدمت سے اور محبت سے، اور ان دونوں راستوں میں قریب تر راستہ خدمت کا ہے، ہمارے طلباء میں خدمت کا مادہ بہت کم ہے یہ افسوس کی بات ہے، اسی طرح استاد کی قدر کرو، مدرسہ کی قدر کرو، مدرسہ کی ٹپائی کی قدر کرو، جس طالب علم میں ادب کا مادہ ہو ان کو اللہ پاک ضرور کامیابی عطا فرمائیں گے۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

مولانا مدثر جمال تونسوی
استاذ الحدیث جامعۃ الصابر بہاولپور

تقسیم مقاصد شریعت

مقاصد شریعت کے طالب علم کے لیے ابتدائی ضروریات میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ان تقسیمات اور اقسام مقاصد شریعت کا علم حاصل کرے جو اس فن کے ماہر اہل علم نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں، اس تحریر میں ہم اسی موضوع کو قابل ذکر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے توفیق اور درست راہ کا سوال ہے انہ ولی ذلک والقادر علیہ

اس سلسلے میں سب سے اول ہم ان اقسام کی توضیح وتشریح پیش کرتے ہیں جو امام ابواسحاق ابراہیم الشاطبی (متوفی ۷۹۰ھ) نے الموافقات فی اصول الشریعۃ میں بیان فرمائی ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں:

والمقاصد التی ینظر فیھا قسمان: احدھما: یرجع الی قصد الشارع، والآخر یرجع الی قصد المکلف (۱)

غور وفکر کے قابل جو مقاصد ہیں وہ دو ہیں:

(۱) وہ مقاصد جو شارع کی طرف لوٹتے ہیں، انہیں ہم ''مقاصد شارع'' کا نام دے سکتے ہیں۔

(۲) وہ مقاصد جو مکلف کی طرف لوٹتے ہیں، انہیں ہم ''مقاصد مکلفین'' کا نام دے سکتے ہیں۔

یہ تقسیم بالکل بدیہی بھی ہے اور سب سے اولین بھی، کیونکہ شریعت میں بنیادی طور پر یہ دو جانبین ہی ہیں، ایک وہ ذات جس نے شریعت وضع فرمائی، یعنی جس ذات نے لوگوں کو شرعی احکامات کا پابند بنایا، جسے ''شارع'' کہا جاتا ہے اور دوسری وہ ذات جس کے لیے شریعت وضع کی گئی ہے اور جنہیں شریعت کا پابند بنایا گیا ہے، اسے ''مکلف'' کہا جاتا ہے۔

مقاصد مکلفین اور چند مفید نکات

امام شاطبی رحمہ اللہ نے ان میں سے دوسری قسم کی اقسام بیان نہیں کی، اس کے تعارف میں اجمالا اتنا بتایا ہے کہ وہ مکلف جو بھی شریعت کا حکم پورا کرے تو اس میں اس کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ عمل شارع کے مقاصد کے موافق ومطابق ہونا چاہئے، پھر اس کی تفصیل اور جزئیات تمام تر مسائل میں الگ الگ شان کے اور حال کے ساتھ پھیلتی چلی جاتی ہیں، چونکہ مسائل کی تعداد بے شمار ہے اسی لیے اس قسم کو چند اقسام میں سمیٹ لینا بھی کافی مشکل ہے۔

البتہ امام شاطبی رحمہ اللہ تعالیٰ کی دو عبارات جو اس سلسلے میں کافی مفید اور بات کی وضاحت پر مشتمل ہیں، انہیں ملاحظہ کر لیجئے:

قصد الشارع من المکلّف ان یکون قصدہ فی العمل موافقا لقصدہ فی التشریع والدلیل علی ذلک ظاھر من

وضع الشریعة اذقد مر انها موضوعة لمصالح العباد علی الاطلاق والعموم والمطلوب من المکلف ان یجری علی ذلک فی افعاله وان لا یقصد خلاف ماقصد الشارع (۲)

شارع کا مکلف سے تقاضا یہ ہے کہ اس کا عمل انہی مقاصد کے لیے جو شارع کی طرف سے مطلوب ہے، دلیل اس کی خود وضع شریعت سے ہی ظاہر ہے کیونکہ یہ بات گزر چکی ہے کہ شریعت وضع کرنے کا مقصد بغیر کسی قید وتخصیص کے بندوں کی نفع رسانی ہے اور مکلف سے یہی مطلوب ہے کہ وہ اپنے افعال میں انہی مقاصد شریعت پر چلتا رہے اور شارع کی خلاف ورزی کا قصد کرنے سے باز رہے۔

اسی بحث میں مسئلہ ثالثہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

کل من ابتغی فی تکالیف الشریعة غیر ما شرعت له فقد ناقض الشریعة و کل من ناقض الشریعة فعمله فی المناقضة باطل فمن ابتغی فی التکالیف مالم تشرع له فعمله باطل (۳)

جو شخص بھی تکالیف شرعیہ میں مقاصد شریعت کے برخلاف مقاصد تلاش کرے گا تو وہ شریعت سے مقابلہ بازی شمار ہوگی اور جو شریعت سے مقابلہ بازی کرے گا تو اس مقابلہ بازی میں اس کا عمل بے کار ہوگا، اس لیے جو بھی شرعی احکام میں ملحوظ مقاصد شریعت کے علاوہ مقاصد تلاش کرے گا تو اس کا عمل باطل ہوگا۔

ان دو عبارات کا خلاصہ تین نکات ہیں:

(۱) شارع کا تقاضا یہ ہے کہ مکلف احکام شریعت میں انہی مقاصد کو ملحوظ رکھے جو خود شارع نے ان احکام میں ملحوظ رکھے ہیں۔

(۲) شارع کی طرف سے ملحوظ رکھے گئے مقاصد کے علاوہ مقاصد کو تلاش کرنا شارع کے ساتھ مقابلہ بازی جیسے جرم کے مترادف ہے۔

(۳) شارع کی طرف سے ملحوظ رکھے گئے مقاصد کے خلاف مقاصد تلاش کرتے ہوئے جو عمل کیا جائے گا وہ عمل باطل شمار ہوگا۔

الغرض شارع نے اعمال کی شکل میں قالب عطاء کیا ہے اور مقاصد کی شکل میں قلب، اب مکلّف پر لازم ہے کہ قالب اور قلب دونوں باتوں میں شارع سے رہنمائی لے اور اسی کی پیروی کرے، اگر قالب اپنی طرف سے گھڑ لیا تو بھی وہ عمل مردود ہوگا اور اگر قالب شرعی ہو لیکن قلب شرعی نہ ہو تو بھی عمل مردود ہوگا۔ واللہ اعلم

امام شاطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک بڑی دلچسپ دلیل دی ہے، فرماتے ہیں:

ان حاصل هذا القصد یرجع الی ان ماراه الشارع حسنا فهو عند هذا القاصد لیس بحسن و مالم یره الشارع حسنا فهو عنده حسن و هذه مضادة ایضاً (۴)

شارع کے مقاصد کے برخلاف مقاصد ملحوظ رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ شارع نے جن مقاصد کو حسن قرار دے کر مطلوب و ملحوظ رکھا تھا اس نے انہیں غیر مطلوب وغیر ملحوظ کا درجہ دے کر غیر حسن بنا دیا اور جن مقاصد کو شارع نے ملحوظ نہ رکھ کر حسن قرار نہیں دیا تھا اس نے انہیں ملحوظ رکھ کر حسن بنا دیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ شارع کے ساتھ مقابلہ بازی ہے!!

چنانچہ اس امر کی مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں

للمسئلة امثلة كثيرة، كاظهار كلمة التوحيد قصدا لإحراز الدم و المال لا الاقرار للواحد الحق بالوحدانية و الصلاة ينظر اليه بعين الصلاح و الذبح لغير اللّٰه و الهجرة لينال دنيا يصيبا و امراة ينكحها و الجهاد للعصبية او لينال شرف الذكر فى الدنيا (۵)

اس مسئلے کی کئی مثالیں مثلاً: اللہ تعالی کی وحدانیت کے اقرار کرنے کے بجائے محض اپنی جان اور مال بچانے کے لئے کلمہ توحید کا اظہار کرنا، لوگوں کی نظر میں نیک بننے کے لیے نماز پڑھنا، غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا، دنیا یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کرنا اور عصبیت یا دنیاوی شہرت حاصل کرنے کے لیے جہاد کرنا.....

اس قدرے تفصیل کے بعد اب ہم قسم اول ''مقاصد شارع'' کی طرف لوٹتے ہیں جسے امام شاطبی رحمہ اللہ تعالی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہم بھی یہاں انہی اقسام کو قدرے توضیح وتشریح کے ساتھ سامنے لانا چاہتے ہیں۔

مقاصد شارع اور ان کی تفصیل

امام شاطبی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں

فالاول يعتبر من جهة الشارع فى وضع الشريعة ابتداء و من جهة قصده فى وضعها للأفهام، و من جهة قصده فى وضعها للتكليف بمقتضاها و من جهة قصده فى دخول المكلف تحت حكمها فهذه اربعة انواع (۶)

مقاصد شارع میں چار پہلو ملحوظ ہوتے ہیں:

(۱) شریعت وضع کرنے کا سب سے اولین مقصد اور اس مقصد کا عنوان ہے: مصالح العباد فى الدارين، یعنی شارع نے شریعت وضع کرتے وقت اولین مقصد یہی مدنظر رکھا ہے کہ لوگ ان کی رعایت رکھ کر دُنیا وآخرت میں منافع حاصل کریں۔

(۲) شریعت کے احکام قابل فہم ہونے چاہئیں، یعنی شارع نے شرعی احکام کو اس طرح وضع فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے قابل فہم ہوں۔

(۳) شریعت کے احکام اس لیے وضع کئے گئے تا کہ ان کے مقتضا پر عمل کیا جائے۔

(۴) شریعت کے احکام اس لیے وضع کیے گئے تا کہ وہ احکام مکلّف لوگوں کی وسعت وتکلیف کے تحت داخل ہوں۔

ان چاروں قسموں میں بہت گہرا ربط موجود ہے، چنانچہ غور سے دیکھا جائے کہ سب سے پہلے شارع نے یہ ملحوظ رکھا کہ احکام شریعت لوگوں کو دنیا وآخرت میں نفع پہنچانے کے لیے ہونے چاہئیں اور اس میں سہولت کے لیے یہ بھی ملحوظ رکھا کہ وہ قابل فہم ہوں، اور پھر مزید سہولت کے لیے یہ واضح کیا گیا کہ وہ احکام اپنے مقتضا پر عمل کے لیے ہیں، محض فکری ونظری تفریحات کے لیے نہیں ہیں اور پھر وہ ایسے احکام ہیں جو مکلفین کی قدرت کے تحت داخل ہیں تا کہ کسی بھی پہلو سے مکلفین کے لیے شرعی احکام سے اعراض کرنے کا عذر باقی نہ رہے۔

پہلے مقصد کی توضیح اور دلیل

شارع کی طرف سے وضع شریعت کا پہلا مقصد بندوں کا دارین میں نفع رسانی ہے، نصوص شرعیہ میں غور وفکر کرنے اور پوری

نظر دوڑانے سے اس حقیقت کی بھرپور نشاندہی ہوتی ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے دلیل استقراء کو بنیاد بناتے ہوئے امام شاطبی تحریر فرماتے ہیں:

والمعتمد إنما هو أنا استقرينا من الشريعة أنها وضعت لمصالح العباد استقراءً لا ينازع فيه الرازي ولا غيره، فإن الله تعالى يقول في بعثه الرسل - وهو الأصل: رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء: ١٦٥)، وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ (الأنبياء: ١٠٧) وقال في أصل الخلقة: وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (هود: ٧)، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاريات: ٥٦) الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (الملک: ٢) وأما التعاليل لتفاصيل الأحكام في الكتاب والسنة، فأكثر من أن تحصى؛ كقوله بعد آية الوضوء: مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (المائدة: ٦) وقال في الصيام: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرة: ١٨٣) وفي الصلاة: إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (العنكبوت: ٤٥) وقال في القبلة: فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ (البقرة: ١٥٠) وفي الجهاد: أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (الحج: ٣٩) وفي القصاص: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرة: ١٧٩) وفي التقرير على التوحيد: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ (الأعراف: ١٧٢)، والمقصود التنبيه. وإذا دلّ الاستقراء على هذا، وكان في مثل هذه القضية مفيدًا للعلم، فنحن نقطع بأن الأمر مستمرٌّ في جميع تفاصيل الشريعة. (٧)

معتمد دلیل یہ ہے کہ ہم نے جب شرعی احکام میں پوری طرح نظر دوڑائی تو ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ یہ شریعت از اول تا آخر بندوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے مقرر کی گئی ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس میں نہ تو امام رازی کا کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی کسی اور کا، چنانچہ رسولوں کی بعثت کو بتلاتے ہوئے قرآن کریم نے واضح کیا ہے کہ ہم نے رسول بھیجے خوشخبری سنانے والے اور ڈر سنانے والے تاکہ ان رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی حجت اور عذر باقی نہ رہے، دوسری جگہ فرمایا: اور ہم نے تو آپ جہان والوں کے بس رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے، انسانوں کی تخلیق اور پیدائش کی سبب اور بنیاد واضح کرتے ہوئے قرآن نے مقصد پر بھی روشنی ڈالی ہے اور فرمایا: اسی نے آسمانوں اور زمین کو سات دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں سے اچھے عمل کرنے والا ہے، نیز فرمایا: میں نے انسانوں اور جنوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں، نیز سورۃ الملک میں بھی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون اچھے عمل کرنے والا، یہ دو بنیادی اور اساسی مقاصد تھے، جب کہ احکامات کی تفصیلی تعلیلات اور مقاصد پر قرآن وسنت میں اس قدر روشنی ڈالی گئی ہے جو شمار سے باہر ہے۔ مثلاً آیت وضو کے بعد ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ نہیں کہ تمہیں تنگی میں ڈال دے بلکہ اس کا ارادہ یہ ہے کہ تمہیں پاکیزگی عطاء کرے اور تم پر اپنی نعمت پوری کردے تاکہ تم شکر گزار بنو! روزوں کا حکم دیتے

ہوئے بھی اس بنیادی مقصد کو تذکرہ موجود ہے ارشاد فرمایا: تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے والوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم پرہیز گار بنو، نماز کے بارے میں ارشاد فرمایا: بے شک نماز بے حیائی اور بُرائی سے روکتی ہے، استقبال قبلہ کے حکم میں ارشاد فرمایا: تم لوگ اپنا چہرہ کعبہ کی طرف کرو تا کہ لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے، جہاد کے بارے میں ارشاد فرمایا: (قتال کی) اجازت دی گئی اُن لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی تھی کیونکہ ان پر ظلم ڈھایا جا رہا تھا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے، حکم شرعی قصاص کے ذیل میں بھی اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا: اور اے عقل مند لوگو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے تا کہ تم (قتل ناحق جیسے جرائم سے) بچ سکو، توحید کو ثابت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: کیوں نہیں! ہم تو گواہی دیتے ہیں (یہ یاددھانی اس لیے کرائی گئی) کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم تو اس سے غافل ہو گئے تھے، جب پوری چھان پھٹک اس حقیقت پر دلالت کر رہی ہے اور یہ چھان پھٹک اس جیسے معاملات میں یقینی علم کا فائدہ پہنچاتی ہے تو ہم پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ شارع کا یہ مقصد پوری ہی شریعت میں کارفرما ہے اور اسی بنیاد پر شریعت میں قیاس اور اجتہاد کا دروازہ کھولا گیا ہے۔

مصالح شرعیہ کے تین درجات

شارع نے شرعی احکام میں جو پہلا مقصد مدنظر رکھا وہ مصالح دارین ہے جیسا کہ اوپر ذکر کر دیا گیا ہے، مگر یہ سب مصالح برابر درجے کی نہیں ہیں، بلکہ بعض مصلحتوں کا مقام و مرتبہ اور ضرورت و اہمیت دیگر بعض سے بڑھا ہوا ہے، اس لیے علمائے مقاصد میں امام شاطبی نے ان مصالح کو تین درجات میں تقسیم کیا ہے:

مقاصد ضروریہ

یہ وہ مقاصد ہیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے، بایں معنیٰ کہ اگر یہ مقاصد بالکلیہ ترک کر دیئے جائیں تو انسانی زندگی بے کار، بے ڈھنگ اور بے ہنگم بن جائے اور ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے اور پوری انسانیت فساد اور بگاڑ کا شکار ہو جائے، مثلاً نکاح: یہ ایک حکم شرعی ہے اور اس میں جو شرعی مقاصد ملحوظ ہیں ان میں سے ایک نسل انسانی کی بقاء اور نسب و حسب کی حفاظت بھی شامل ہے، اب اگر کسی لمحے پوری انسانیت یا انسانوں کی کوئی قوم اس حکم شرعی کو بالکلیہ ترک کر دیتی ہے یا کوئی قوم نکاح کو چھوڑ کر زنا کاری و بدکاری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو یہ کتنا بڑا فساد ہوگا؟ کتنے ہی خاندانوں اور کتنے ہی قبیلوں کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور ایک پوری نسل انسانی کا وجود مٹنے پر آ جائے گا جو کہ نہ تو شارع کو مطلوب ہے اور نہ ہی شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔

ان مصالح ضروریہ میں پانچ چیزوں کی حفاظت شامل ہے:

☆ دین کی حفاظت ☆ نفس انسانی کی حفاظت ☆ عقل انسانی کی حفاظت ☆ نسل انسانی کی حفاظت ☆ مال کی حفاظت

یہی پانچ مصالح ضروریہ امام شاطبیؒ نے ذکر فرمائی ہیں اور امام غزالیؒ نے بھی ذکر فرمائی ہیں اور پھر اکثر اہل علم نے انہی کی پیروی کرتے ہوئے یہی بات کہی ہے۔

چنانچہ امام غزالی کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

ومقصود الشرع من الخلق خمسة: وهو أن يحفظ عليهم دينهم، ونفسهم، وعقلهم، ونسلهم، ومالهم، فكل ما يتضمن حفظ هذه الأصول الخمسة فهو مصلحة، وكل ما يُفوِّت هذه الأصول فهو مفسدة، ودفعها مصلحة۔۔۔ وهذه الأصول الخمسة حفظها واقع فی رتبة الضرورات، فهی أقوى المراتب فی المصالح، ومثاله قضاء الشرع بقتل الكافر المضل، وعقوبة المبتدع الداعی إلى بدعته، فإن هذا يفوت على الخلق دينهم، وقضاؤه بإيجاب القصاص، إذ به حفظ النفوس، وإيجاب حد الشرب، إذ به حفظ العقول التی هی ملاک التكليف، وإيجاب حد الزنا إذ به حفظ النسب والأنساب، وإيجاب زجر النصاب والسراق، إذ به يحصل حفظ الأموال التی هی معايش وهم مضطرون إليها، وتحريم تفويت هذه الأمور الخمسة والزجر عنها يستحيل ألا تشتمل عليه ملة من الملل وشريعة من الشرائع التی أريد بها إصلاح الخلق (۸)

مخلوق سے شارع کو جو مطلوب ہے وہ پانچ چیزیں ہیں: ان کے دین، ان کی جان، ان کی عقل، ان کی نسل اور ان کے مال کی حفاظت، ہر وہ کام جو ان پانچ مقاصد کی حفاظت کا سبب ہو وہ مصلحت ہوگا اور ہر وہ عمل جو ان کو مقاصد کو برباد کرنے والا ہوگا وہ فساد ہوگا اور اس فساد کو دفع کرنا مصلحت کہلائے گا..... ان پانچ چیزوں کی حفاظت ضرورت کا درجہ رکھتی ہے اور مصالح میں انہی کی حفاظت کا مرتبہ سب سے قوی ہے، اس کی مثال میں یہ دیکھئے کہ شریعت گمراہ کنندہ کافر کو قتل کرنے کا حکم دیتی ہے اور بدعات پھیلانے والے بدعتی کو سزا کا مستحق گردانتی ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ ان دونوں افراد کا طرز عمل مخلوق خداوندی کے دین کے بگاڑ کا سبب ہے، اسی طرح شریعت قصاص کو واجب کرتی ہے کیونکہ یہ عمل دیگر بے شمار جانوں کی حفاظت کا سبب ہے، شراب نوشی پر حد جاری کرتی ہے کیونکہ اس کے سبب انسان کو مکلف بنائے جانے کی بنیاد ''عقل'' کی حفاظت کا سامان ہوتا ہے، زنا کاری کی صورت میں شرعی سزا کا حکم جاری ہوتا ہے کیوں اگر یہ نہ ہو اور زنا کاری کی کوئی سزا اور اس پر کوئی روک نہ ہو تو اس سے خاندانوں اور قبیلوں کے نسب میں بگاڑ پیدا ہوجائے گا، چوری وغیرہ کی صورت میں بھی شرعی سزا اسی لیے کہ یہ چیز لوگوں کے سامان اور مال ومتاع کی حفاظت کا سبب ہے اور مال ومتاع کی حفاظت کا بندوبست ضروری ہے کہ انسانی زندگی اور لین دین کا کلی مدار اسی پر ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ بات بالکل محال ہے کہ کوئی بھی شریعت وملت جو انسانی اصلاح کا پیغام رکھتی ہو وہ ان پانچ چیزوں کی حفاظت کے اسباب ووسائل اور احکام وہدایت سے خالی ہو!!

ان مقاصد کی حفاظت کے دو طریقے

(۱) ایسے اَسباب فراہم کرنا اور بروئے کار لانا جس سے یہ مصالح پروان چڑھیں۔

(۲) ایسے اَسباب سے اِجتناب کرنا اور انہیں دور کرنا جس سے یہ مصالح فوت ہوتے ہوں۔

حفاظت دین

چنانچہ جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے دین کی حفاظت کے لیے یہی دونوں طریقے بروئے کار لانا ضروری ہے۔

مثبت پہلو سے دیکھئے تو ضروری ہوتا ہے کہ اَرکان دین کو قائم اور مضبوط کیا جائے، اسی لیے شریعت نے دین کی اساس کی نشاندھی کردی اور فرمایا:

اسلام کی بنیاد پر پانچ چیزوں پر ہے: لاالہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکوۃ اداء کرنا، روزے رکھنا، اور حج کرنا(۹)

اسی طرح ایمان کی بنیاد بتاتے ہوئے واضح کیا گیا کہ:

ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالی پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر اور ہر اچھی بُری تقدیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاننے پر ایمان لاؤ(۱۰)

اسی دین کی حفاظت کے لیے اس کے دوسرے پہلو سے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ وہ تمام اسباب دور کیے جائیں جو اس دین کے بگاڑ کا سبب ہوں، اسی لیے جارح کافروں سے جہاد کا حکم دیا گیا، اسی لیے دین کی بنیاد پر ستائے جانے والے کمزور مسلمانوں کی مدد وحمایت اور دِفاع کا حکم دیا گیا، اور اسی مقصد کے لیے الحاد، دہریت اور بدعات پھیلانے کو سزا دینے کی اجازت دی گئی جیسا کہ اوپر امام غزالی رحمہ اللہ کی عبارت میں ذکر ہوا ہے۔

ان دونوں پہلوؤں کو کام میں لایا جائے تب ہی دین کی حفاظت کا کامل سامان ہوگا، اگر ان میں سے کسی بھی پہلو کو ترک کردیا جائے یا اس سے بے اعتنائی برتی جائے تو دین کی حفاظت کا مقصد یا تو سرے سے فوت ہوجائے گا یا غیر موثر ہوکر رہ جائے گا۔

انسانی جان کی حفاظت

انسانی جان کی حفاظت کے لیے مثبت پہلو یہ ضروری قرار دیا گیا کہ انسان بوقت ضرور کھانا کھائے، پانی پیئے، لباس پہنے، رہائش کے لیے کسی گھر، ٹھکانے کا انتظام کرے، الغرض اپنی جان کی حفاظت کے لیے کھانے، پہننے اور رہائش کی شکل میں جو ضروریات ہیں انہیں کام میں لائے اور ایسا کرنا ہرگز ممنوع نہیں بلکہ شریعت کا مطلوب ہے۔

پھر اسی انسانی جان کی حفاظت میں خلل ڈالنے والے اسباب کی ممانعت کردی گئی، چنانچہ خودکشی کو اسی لیے حرام قرار دیا گیا، اور جو شرعی اجازت کے بغیر کسی جان کو مار ڈالے تو اس پر قصاص کا حکم دیا گیا اور واضح کردیا گیا کہ یہ حکم انسانی جان کو ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ(۱۱)

اے سمجھدار لوگو! قصاص میں تو تمہارے لیے زندگی ہی ہے!

حفاظت عقل

اس کی حفاظت کے لیے مثبت اعتبار سے تو یہ حکم دیا گیا کہ عقل کو کام میں لاؤ، اسے سوچ وبچار کیا کرو، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کیا کرو، چنانچہ کہیں فرمایا: افلا ینظرون ؟ کیا وہ دیکھتے نہیں ہیں؟..... کہیں فرمایا: افلا یعقلون، کیا وہ عقل نہیں رکھتے ؟..... کہیں فرمایا: لعلھم یتفکرون، شاید وہ غور وفکر سے کام لے لیں!

اسی عقل کی حفاظت کے لیے منفی جانب میں وہ اُن تمام چیزوں سے پرہیز کا حکم دیا گیا جو اس کے بگاڑ کا سبب ہوں۔ چنانچہ اسی لیے تمام نشہ آور چیزوں پر روک لگادی گئی، اور جو انسانی عقل کو بگاڑنے والے اشیاء مثلاً شراب وغیرہ کو فروخت کرتا ہو اس کے لیے بھی سخت وعیدیں سنادی گئیں اور جو ان سب سے بڑھ کر ان چیزوں کو استعمال کرلے مثلاً شراب پی لے تو اس پر شرعی سزا نافذ کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ خود بھی آئندہ اس کے ارتکاب سے اجتناب کرے اور دوسروں کو بھی عبرت ہو۔

نسل کی حفاظت

اس کی حفاظت میں بھی دونوں پہلو مدنظر رکھے گئے، ایک طرف شریعت نے کچھ ایسے طریقے جائز اور مباح قرار دے دیئے جس سے مرد وزن میں تعلقات قائم ہوں اور ان کے ملاپ سے نسل انسانی کی بقاء اور تحفظ کا سامان ہوتا رہے، چنانچہ اسی مقصد کے لیے شریعت نے نکاح کے احکام دیئے، میاں بیوی کے باہمی حقوق پر روشنی ڈالی، اور بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کے احکام دیئے۔

دوسری جانب ان تمام راستوں پر پابندی لگادی جو اس نسل انسانی کی حفاظت اور بقاء کے راستے میں خلل انداز ہوتے ہوں، اسی لیے زنا کاری کو حرام قرار دیا، کسی پر زنا کا جھوٹا الزام لگانے پر بھی سزا مقرر کی بلکہ زنا تک پہنچانے والے اسباب پر بھی روک لگادی، اسی لیے بدنظری اور بدکلامی کو ممنوع قرار دیا اور اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے کہا گیا: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (۱۲) تم لوگ زنا کے قریب بھی مت جاؤ۔

مال کی حفاظت

اس کی حفاظت کے لیے ایک طرف ایسے اسباب مشروع کیے گئے جس سے اس میں اضافہ اور بڑھوتری ہوتی رہے تاکہ لوگوں کی ضروریات کی تکمیل ہوسکے، اسی لیے خرید وفروخت کے ایسے احکام دیئے گئے جس میں باہمی رضامندی بھی موجود ہو اور کسی ایک فریق کے لئے دھوکہ بھی نہ ہو۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ (۱۳)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ (یہ حرام ہے، ہاں یہ جائز ہے کہ) آپس کی خوشی سے تجارت کی صورت میں ہو۔

اسی مال کی حفاظت کے لیے دوسری جانب ان صورتوں پر سزائیں مقرر کیں جو حقیقت میں اس مال کو تلف کرنے کا سبب ہوں، مثلاً چوری، بظاہر اس میں مال بذات خود ضائع نہیں ہوا، بس ایک شخص کے قبضے سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں چلا گیا مگر حقیقت میں یہ مال ہی تلف ہوا ہے، کیونکہ اگر اس طرز پر روک نہ لگائی جائے تو لوگ جائز طریقوں سے مال حاصل کرنا اور محنت مزدوری کرکے مال کمانا چھوڑ دیں گے اور جب ایسا ہوگا تو مال خود بخود ہی ناپید ہوجائے گا، اس لیے شریعت نے چوری، دھوکہ دہی، رشوت ستانی اور جھوٹی قسم کھاکر مال حاصل کرنے سے منع کیا اور بعض صورتوں میں سزائیں بھی مقرر کردیں۔

الغرض شریعت نے نہایت ہی حکمت کے ساتھ ان پانچوں مقاصد کی حفاظت کے لیے جامع اور کلی احکامات دے دیئے ہیں، اوران کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا ہے اور کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا، ان پانچوں مقاصد کو پروان چڑھانے اور مضبوط بنانے کے اسباب بھی فراہم کیے ہیں اوران میں خلل ڈالنے والی چیزوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر روک بھی لگادی ہے۔ یہ شریعت اسلامیہ کی بڑی خوبصورتی اور جامعیت کی دلیل ہے۔اس میں نہ تو صرف کسی چیز کی صفائی پر زور ہے اور نہ ہی محض کسی چیز کی آرائش پر زور ہے، بلکہ اس میں دونوں جانبوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، ایک طرف تحلیۃ کا اہتمام صاف نظر آتا ہے تو دوسری جانب تصفیۃ کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

مصادر ومراجع

۱ الموافقات: ج۱،ص۲۶۱

۲ الموافقات: ج۲،ص۴۹۴

۳ الموافقات: ج۲،ص۴۹۵

۴ الموافقات: ج۲،ص۴۹۶

۵ الموافقات: ج۲،ص۴۹۷

۶ الموافقات: ج۲،ص۴۹۷

۷ الموافقات: ج۲،ص۲۶۲

۸ المستصفی للغزالی: ج۱،ص۲۸۷

۹ بخاری شریف: ح۸

۱۰ مسلم شریف: ح۱

۱۱ البقرہ:۱۷۹

۱۲ الإسراء:۳۲

۱۳ النساء:۲۹

جناب سیّد خالد جامعی
مفکر، محقق و ناظم شعبہ تصنیف جامعہ کراچی

خواتین کا مقام مغرب اور متجددین کی نظر میں

جدید سیکولر، لبرل، ماڈرن دنیا میں عورت کی عزت، عصمت، آبرو ہر وقت خطرے میں ہے، سابق امریکی صدر اوباما کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ہر سال کروڑوں عورتوں کے ساتھ جبری زنا کاری ہوتی ہے، سول سوسائٹی کے ہر لبرل سیکولر جمہوریت پسند تعلیم یافتہ امریکی مرد کا ایمان ہے کہ عورت کو صرف جنسی ہوس پورا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، عورت بھی یہی چاہتی ہے یہ امریکی ثقافت ہے، بھارت میں بسوں، ہوائی جہازوں اور ہوٹلوں میں عورتوں سے جبری زنا کاری عام ہے، یونیسکو رپورٹ کے مطابق افریقہ کے اکثر ملکوں میں لڑکیوں کو اسکول نہیں بھیجا جاتا، وہاں اساتذہ بچیوں سے جبری زنا کرتے ہیں لیکن مسلم متجددین (بالخصوص غامدی صاحب) کے مطابق آج کی دنیا عورت کے لئے محفوظ ترین دنیا ہے، عورت کی عزت عہد رسالت میں محفوظ نہیں تھی آج بہت محفوظ ہے، دنیا بھر میں ہوٹل، ریل، جہاز، بس کے سفر میں ہر عورت محفوظ ہے

جب تک مغربی معاشرہ روایتی مذہبی اقدار پر قائم تھا وہاں عورت کی عزت تھی، چار سو سال پہلے کوئی عورت گھر سے باہر نہیں آتی تھی وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کے حکم پر یورپ میں بھی عمل ہوتا تھا، ۱۶۶۵ء میں بادشاہ عورت کو راستے میں دیکھ کر عورت کے احترام میں گھوڑے کو روک دیتا تھا اور عورت کو نہایت اکرام سے گزرنے کا راستہ دیتا تھا، اگر بادشاہ سواری کے بغیر ہوتا اور کوئی عورت نظر آتی تو سر سے ٹوپی اُتار کر عورت کی تعظیم کرتا (اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت کبھی کبھی نظر آتی تھی اگر جدید شہروں کی طرح ہر طرف عورتیں ہی عورتیں ہوتیں تو بادشاہ صبح سے رات تک عورت کے احترام میں کھڑا رہتا اور کبھی اسے احترام سے فرصت نہ ملتی اور احترام میں ہی اس کا انتقال ہوجاتا) برنارڈ لیوس اپنی کتاب What Went Wrong میں عورت اور بادشاہ سے متعلق اس عظیم روایت کا ذکر ترک سفارت کار کے سفر ویانا Vienna آسٹریلیا کے مشاہدات کے حوالہ سے کیا ہے، یورپ میں عورت کی کتنی عزت تھی؟ ترک سفیر اپنے مکتوب میں لکھتا ہے

The first comes from Evliya elebi, a famous Turkish writer of his time who visited Vienna in 1665 as part of an Ottoman diplomatic mission. In the course of a long and detailed account of the imperial capital "In this country I saw and his adventures there, Evliya describes a “most extraordinary spectacle” that he saw. an extraordinary spectacle. Whenever the emperor meets a woman in the street, if he is riding, he brings his horse to a standstill and lets her pass. If the Emperor is on foot and meets a woman, he stands in a posture of politeness. The woman greets the emperor, who then takes his hat off his head to show respect for the woman. After the woman has passed, the emperor continues on his way. It is indeed an extraordinary spectacle. In this country and in general in the lands of the unbelievers, women have the main say. They are

honored and respected out of love for Mother Mary".[Bernard Lewis, What Went Wrong: western impact and Middle Eastern response, Oxford University Press 2002 Chapter 3, Social & Cultural Barriers, p. 64-65]

صرف ۱۵۳ سال میں ترقی کرتے کرتے عورت امریکہ یورپ اور مغرب میں اس حالت کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے گھر میں اپنے باپ سے بھی محفوظ نہیں ہے Incest Relations مغرب میں عام ہیں گھروں سے بھاگنے والی لڑکیوں میں ۳۵ فی صد وہ لڑکیاں ہیں جو اپنے محرموں (باپ، بھائی، چچا، ماموں، خالو، بیٹا) کی جنسی دہشت گردی سے بچنے کے لیے بھاگتی ہیں، حیرت کی بات یہ ہے کہ مغرب کی وہ لڑکی جو مساوات کی قائل ہے، اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ آزادانہ Sex کرتی ہے مگر جب محرموں بھائی، باپ، چچا میں سے کوئی اس سے مساوات کے عقیدے کے تحت زنا کرنا چاہتا ہے تو یہ کبھی آمادہ نہیں ہوتی یہ انسانی فطرت ہے جو مغرب کے فطرت سے باغی لوگوں میں آج بھی زندہ ہے، منشور انسانی حقوق میں مساوات کا عقیدہ فطرت سے انحراف بلکہ بغاوت ہے تمام روایتی، الہامی، مذہبی تہذیبوں میں کوئی برابر Equal نہیں ہوتا، مراتب وجود ہوتے تھے ہر ایک فرد کا مقام مرتبہ الگ الگ ہوتا تھا اسی لیے سترہویں صدی سے پہلے کسی روایتی تہذیب میں آزادی، مساوات کے عقیدے، Citizen سول سوسائٹی، انسانی حقوق سرے سے نہیں ہوتے تھے مگر اس کے باوجود کسی بھی تہذیب کا انسان دوسری تہذیب کے علاقوں کا سفر پاسپورٹ ویزہ کے بغیر کرسکتا تھا جب سے معاہدہ ''یالٹا'' اور معاہدہ ''وسٹ فیلیا'' آیا، منشور انسانی حقوق اور مساوات کا عقیدہ آیا قومی سرحدیں کھینچ کر بتادیا گیا کہ کوئی یہاں نہیں آسکتا اور نہ کوئی قومی ریاست مذہبی ہوسکتی اس کا نام مساوات، آزادی اور انسانیت ہے لیکن اگر آپ امیر ہیں تو امریکا سمیت دنیا کے کسی بھی ملک کی شہریت چار گھنٹے میں حاصل کرسکتے ہیں یقین نہ آئے تو مائیکل سانڈل کی کتاب Justice پڑھ لیجئے! اب تو فوج بھی قومی نہیں رہی سانڈل نے لکھا ہے کہ فرانس کی فوج کے ۲۵ فیصد لوگ غیر فرانسیسی ہیں، قومی سرحدیں شہریت، قومیت، آزادی اور آزادی مساوات کا انکار ہیں جن تہذیبوں اور اسلامی تہذیب میں نہ آزادی تھی نہ مساوات وہاں نہ سرحد تھی نہ پاسپورٹ نہ ویزہ۔

امریکی مرد سمجھتا ہے کہ عورت کو زنا کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے: اوبامہ رپورٹ

امریکہ میں کروڑوں عورتوں، مردوں اور فوجیوں سے جبری زنا کیا جاتا ہے، امریکا کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں اور دفاتر، کارخانوں، دکانوں، مارکیٹ، کمپنیوں میں تعلیم اور ترقی کے لیے جانے والی لڑکیوں، عورتوں بلکہ لڑکوں مردوں کے ساتھ مغرب میں کیا ہورہا ہے؟ اس کی ایک جھلک وہائٹ ہاؤس سے جاری ہونے والی رپورٹ Reviewed Call Rape & Sexual Assualt: A to Action , Jan 2014 میں دیکھیے! یہ رپورٹ وائٹ ہاؤس کی ویب سائٹ پر موجود ہے، رپورٹ کے مطابق ۲۲ ملین امریکی عورتوں سے، دو ملین لڑکوں سے جبری زنا کیا جاتا ہے رضامندی سے ہونے والے کروڑوں زنا اس فہرست میں شامل نہیں، اسکول، یونیورسٹی اور کالج میں جبری زنا کی وارداتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں جبری زنا کرنے والے تمام مرد لڑکیوں کے جگری دوست، عشاق، ہم مشرب وہم مسلک قریبی رشتہ دار، اعتماد کے لوگ اور خونی رشتوں والے ہوتے ہیں ان اداروں میں صرف عورت ہی نہیں مرد بھی محفوظ نہیں ہے ان کی عزتیں بھی لوٹی جاتی ہیں۔

رپورٹ بتاتی ہے کہ اسکول، کالج، یونیورسٹی میں نشانہ بننے والے صرف ۱۲ فی صد مظلوم جنسی دہشت گردی کی رپورٹ درج کراتے ہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہر دوسری لڑکی جنسی درندگی کا شکار ہے، ترقی اور تعلیم کے لیے مغرب کی عورت کو یہ ظلم گوارا ہے، یہ اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ امریکی ثقافت جبری زنا کاری کی اجازت دیتی ہے، رپورٹ کے مطابق امریکی ثقافت میں ابھی تک مرد یہ سمجھتے ہیں کہ عورت خود مرد سے جنسی تعلق قائم کرنا چاہتی ہے یعنی عورت کو اسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، مغرب میں ترقی عقیدہ ہے جس سے آزادی ملتی ہے اور آزادی کے لیے سرمایہ Capital کی ضرورت ہے کیونکہ آزادی کی ٹھوس شکل صرف سرمایہ ہے جو صرف تعلیم اور کام سے ملتا ہے، مغرب میں جو کام نہیں کرتا، پیسے نہیں کماتا وہ پاگل کہلاتا ہے فوکالٹ لکھتا ہے The absence of work is madness لہٰذا تعلیم، ترقی، آزادی، سرمایہ ایک دوسرے سے خلقی طور پر جڑے ہوئے ہیں لہٰذا مغرب کی عورت کو اگر تعلیم کے ذریعے ترقی کرنا ہے تو جبری زنا کاری، جنسی تکالیف برداشت کرنا ہوں گی آزادی کا حصول ان آلام، آزمائشوں، تکالیف کے بغیر ممکن نہیں آزادی بھی کئی پابندیوں، تکالیف، دشواریوں کے بعد ملتی ہے، صبح بستر سے اٹھ کر تعلیم گاہ جانے کا جبر برداشت کیے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا یہ دنیا کا مشترکہ عقیدہ ہے

امریکی فوج میں عورتیں اور مرد بھی بڑے پیمانے پر جنسی درندگی کا شکار ہیں رپورٹ میں سرحدوں کے ان محافظوں کی عزت کی حفاظت کے لیے تجاویز دی گئی ہیں، جو ملک اپنی فوج کی عورتوں کی عزت اور فوج کے مرد سپاہیوں کی حفاظت نہیں کرسکتا وہ دنیا بھر کو آزادی کا سبق سنانے کے لئے اور آزادی کی حفاظت کے لیے نکلا ہوا ہے، امریکی فوج میں جبری بدفعلی، جبری زنا کاری کے ہزاروں واقعات پر مبنی کتابیں شائع ہورہی ہیں پاکستانی لبرل دانشوران مباحث کا ذکر نہیں کرتے صرف اسلام اور مولوی کو گالیاں دیتے ہیں۔

۲۰۱۴ء کی اس رپورٹ میں اوباما نے بتایا ہے کہ امریکی عورتیں اپنے گھروں میں محرم رشتے داروں کے جنسی تشدد کا شکار ہیں گھروں سے بھاگنے والی چھتیس فی صد لڑکیاں، عورتیں اپنے مرد رشتہ داروں کی جنسی درندگی سے بچنے کے لیے بھاگتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ رشتے دار بھائی، بیٹے، دیور، سسر، چچا، ماموں ہوتے ہیں، کروڑوں عورتیں جن سے جبری زنا کیا جاتا ہے مقدمات ہی درج نہیں کراتیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ کوئی کارروائی نہیں ہوگی اور ہوگی تو سالوں لگ جائیں گے، ہر لڑکی کو اپنے بچپن میں محلے میں گھر کے آس پاس اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں جبری زنا کاری کا اندیشہ ہے، صرف لڑکیوں کو نہیں لڑکوں کو بھی خطرہ ہے ان کی عزت بھی محفوظ نہیں، ان سے بدفعلی کی جاتی ہے، پورا امریکی معاشرہ جنسی درندگی میں مبتلا ہے، لڑکیوں سے جبری زنا کرنے والے ان کے دوست ان کی رضامندی سے بھی زنا کاری کرتے ہیں مگر اس کے باوجود جبری زنا میں وہ زیادہ لذت محسوس کرتے ہیں لہٰذا لڑکیوں کے دوست، عاشق، بوائے فرینڈز انہیں نشہ آور چیزیں پلا کر جبری زنا کرتے ہیں صرف زنا نہیں کرتے نہایت بہیمیت، درندگی کے ساتھ مارتے پیٹتے اور شدید زخمی بھی کرتے ہیں یہ سول سوسائٹی ہے، ۳۶ صفحات پر مشتمل یہ رپورٹ اس مضمون کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کی گئی ہے جس کا مطالعہ آپ کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے، رافعہ زکریا، سجاد عاصم، آئی اے رحمان، عاصمہ جہانگیر، بے نظیر جتوئی، یاسر پیرزادہ، حسن نثار، وجاہت مسعود، بابر ستار، جاوید چوہدری، نوید حسن اس مغرب کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے، جہاں عورت اس ذلیل مقام تک پہنچادی گئی ہے۔ ان لبرل دانشوروں کو صرف پاکستانی عورت ظلم و جبر کا شکار نظر آتی ہے امریکا کی آزاد عورت نہایت بدترین حالت میں ہے، یہ صدر امریکا (اوباما) کی شہادت ہے جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔

یورپی یونین میں دو کروڑ عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد کیا گیا

یورپی یونین کا حال امریکا اور آسٹریلیا سے زیادہ بدتر ہے FRA کی ویب سائٹ پر یورپی یونین میں عورتوں کے ساتھ جنسی دہشت گردی کے ہولناک اعداد و شمار دیے گئے ہیں ۵۳٪ عورتوں کو شکایت ہے کہ مرد انہیں گھر سے باہر، بازار میں، اسکول، کالج، یونیورسٹی، دفاتر میں غلیظ نگاہوں سے گھورتے رہتے ہیں ۳۸٪ عورتوں کے ساتھ کئی مرتبہ جبری زنا کاری کی گئی ہے، ۱۳ سال کی لڑکی سے لے کر ۷۳ سال تک کی عورت کو ای میل کے ذریعے فحش اور گندے پیغامات موصول ہوتے ہیں۔

FRA یورپین ایجنسی فار فنڈامینٹل رائٹس نے یورپی یونین کے ۲۸ ممالک میں عورتوں کی بے حرمتی، عزت، عصمت، عفت اور حرمت کی پامالی کی جو حیرت ناک، شرم ناک اور افسوس ناک کہانی Violence against women: an Eu -wide survey. Main results تحقیق کی روشنی میں بیان کی ہے، رپورٹ کے مطابق ایک سال میں ایک کروڑ بیس لاکھ عورتوں کو جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا، تشدد صرف جوان لڑکیوں پر نہیں پچھتر سال کی بوڑھی عورتوں پر بھی ہوا، یہ کیسی انسانیت ہے کہ بوڑھے لوگ بھی اس ظلم سے محفوظ نہیں، تشدد کرنے والے مسلمان، مولوی نہیں تھے یہ سارے مسٹر تھے گویا یورپ کی سات فی صد عورتوں کو جسمانی عذاب سہنا پڑا یہ تعداد بہت کم ہے کیونکہ لاکھوں خواتین بے شمار وجوہات کی بنیاد پر تشدد کی رپورٹ درج نہیں کراتیں۔

چالیس لاکھ عورتوں کے ساتھ جنسی دہشت گردی کی گئی، درندوں نے ستر سال کی بوڑھی عورتوں کو بھی نہیں بخشا، یورپ میں بیس میں سے ایک عورت پندرہ سال کی عمر میں جبری زنا کاری کا شکار ہو جاتی ہے، یعنی یورپی یونین کی ۵ فی صد عورتوں کو ہر سال جبری زنا کا سامنا کرنا ہوتا ہے، لاکھوں عورتیں جو جبری زنا کا شکار ہوتی ہیں وہ رپورٹ درج نہیں کراتیں ان کی تعداد نا معلوم ہے لاکھوں عورتیں وہ ہیں جو رضامندی سے زنا کرتی ہیں وہ قانون کے دائرے میں نہیں آتیں کیونکہ رضامندی سے زنا جرم نہیں ہے یہ آزادی Freedom کا اظہار ہے۔

آزادی کو ناپنے کا واحد پیمانہ پابندیوں میں کمی کے دائرے کو دیکھنا ہے

آزادی کی کوئی مثبت تعریف Positive Defination آج تک طے نہیں کی جا سکی، آزادی کس سے Freedom From آزادی کس کے لیے Freedom for انسان جس معاشرے اور جس اجتماعیت میں پیدا ہوتا ہے وہاں فطری طور پر مختلف پابندیاں ہوتی ہیں مثلاً مذہبی، نسلی، روایتی، سماجی، تاریخی، اخلاقی، خاندانی، گروہی، ان تمام پابندیوں سے آزاد ہونا اور صرف اور صرف اپنے نفس کی غلامی کے تابع ہونا انسانیت کا تقاضہ ہے اسی کو منشور انسانی حقوق میں حق خود اختیاری Right of self determination کہا جاتا ہے یعنی جو چاہے کر گزرو! مگر اس طرح کہ دوسرے کی آزادی متاثر نہ ہو آزادی کے حصول کے لیے ذاتی مفاد پرستی Self ishness کی نہیں اجتماعی مفاد پرستی Self Intrestedness کے رویے کی ضرورت ہے، آزادی کو اس طرح استعمال کرو کہ اس سے دوسرے کی آزادی میں بھی اضافہ، لہٰذا انسانی حقوق کے منشور کے تحت آزادی کو اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ کسی معاشرے میں پابندیوں کا دائرہ کم سے کم ہوتا چلا جائے۔

انسانی حقوق کے منشور پر عمل درآمد کے تمام عالمی، قومی اور مقامی ادارے کسی ملک میں آزادی کو اسی پیمانے سے ناپتے ہیں کہ وہاں موجود پابندیوں میں کتنی کمی ہوئی کیونکہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں مطلق آزادی موجود ہو رفتہ رفتہ پابندیاں جبراً کم کی جارہی ہیں جس سے آہستہ آہستہ آزادی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، سرمایہ دارانہ عدل اسی کا نام ہے منشور حقوق انسانی کا مقصد انسانی راہ میں حائل تمام قانونی، تہذیبی، مذہبی، روایتی، اخلاقی، دینی، الہامی، خاندانی، نسلی، گروہی، قبائلی حد بندیوں کا خاتمہ کر کے انسانی کی آزادی میں لامحدود اضافہ کرتے چلے جانا ہے، کیونکہ اخلاقی، معاشرتی، مذہبی پابندیاں ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں، اقدار، روایات، مذہب، حلال وحرام کی بحث، رشتوں تعلقات کا پاس، ادب، لحاظ، خاندانی نظام، محبت وغیرہ یہ سب معاشی، مادی، ترقی کی رفتار روک دیتی ہیں، بیٹا ماں سے محبت کرتا ہو تو وہ اپنے اعلیٰ ترین مستقبل کو ماں کی خدمت، قربت، محبت پر قربان کر دے گا، اپنے مادی مستقبل پر ماں کی خدمت کو ترجیح دے گا اس رویے سے مادی ترقی میں کمی واقع ہوگی لوگ جتنے زیادہ انفرادیت پسند، آزاد خیال اور ترقی کے خواہش مند ہوں گے فرد، قوم اور سرمایہ ترقی کرے گا۔

جدیدیت Modernism میں نفس مطلق آزاد Absolute free ہے اس کی تعمیر، تربیت، تطہیر، تشکیل، تصفیہ، تزکیہ، اصلاح، تادیب، تلقین، تفکیر کا سرے سے کوئی انتظام نہیں ہے، ہر انسان عقل رکھتا ہے لہٰذا جدیدیت میں لوگوں کے نفس کو کسی دین، وحی، آسمانی روایت، اخلاقی اقدار کا پابند کرنا انسان کے جوہر آزادی Essence of Freedom کا انکار ہے، لہٰذا مغرب میں ہر شخص مطلق آزاد ہے اور یہ آزاد انسان کیا کیا قیامتیں ڈھا رہا ہے یہ آپ کے سامنے ہے؟

پاکستانی تعلیمی اداروں میں کسی لڑکی سے جبری زنا کاری کا تصور محال ہے

علماء، مدارس، مساجد، اولیاء اللہ، دینی جماعتوں کا اثر ہے کہ یہاں جنسی دہشت گردی نہیں، جن معاشروں، تہذیبوں، مذاہب میں عورت کو مغرب جیسی آزادی حاصل نہیں ہے، جو آزادی کے عقیدے کو تسلیم ہی نہیں کرتے، بندگی کے قائل ہیں وہاں عورت آزادی سے نقل وحرکت کرتی ہے اسے کسی مقام پر کسی قسم کے خطرے کا کوئی سامنا نہیں ہوتا، پاکستان اس کی بہترین مثال ہے پاکستانی معاشرے میں عورت کی عزت ہے یہاں وہ بالکل محفوظ ہے۔ وہ جہاں چاہے آزادانہ نقل وحرکت کر سکتی ہے کیونکہ پورا معاشرہ عورت کا بے حد احترام کرتا ہے حتیٰ کہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں کسی لڑکے کی جرأت نہیں کہ امریکا اور یورپ کی طرح کسی لڑکی سے جبری زنا کاری کر سکے اس یونیورسٹی کے لڑکے اس زانی کی تکا بوٹی کر دیں گے رضامندی سے ہونے والے زنا آزادی کا مسئلہ ہے وہ زیر بحث نہیں لہٰذا تمام روایتی، اسلامی، مذہبی، غیر اسلامی روایتی معاشروں میں آج بھی عورت نہایت قابل عزت ہے۔

اگر پاکستانی معاشرے اور پاکستانی اسکول کالج یونیورسٹی میں کوئی لڑکا جبری زنا کی ہمت نہیں کر سکتا تو یہ صرف اور صرف اسلام کی قوت اور علماء کرام، مساجد، دینی مدارس کی پیدا کردہ معاشرت ہے، جسے میڈیا مسلسل ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے، NGO'S اس سلسلے میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں لیکن وہ تمام علاقے، معاشرے، تہذیبیں، مقامات جہاں مغربی تہذیب غلبہ پا چکی ہے، سیکولر تعلیم کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ نظام کی مختلف شکلیں مثلاً قوم پرستی، لبرل ازم، سوشل ازم، نیشنل ازم، فاشزم مسلط ہو گیا ہے وہاں عورتوں کی نقل وحرکت کی آزادی مسلسل خطرے میں ہے، بھارت اس کی بہترین مثال ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت (بھارت) میں زنا کاریاں: عورت کھلونا ہے

بے شرمی، بدکاری اور عورت کی بربادی میں کوئی مغرب سے آگے نہیں میڈیا رپورٹس کے مطابق بھارت میں جنسی درندگی عروج پر ہے، بسوں، ہسپتال، راستوں، ہوٹلوں میں عورتوں کی عزت چار پانچ مرد لوٹ لیتے ہیں مغربی سیاح عورتوں کی عزتیں لوٹنا عام بات ہے، کالوں کو گورے اچھے لگتے ہیں اور یہ غلامی کا انتقام بھی ہے، بھارتی حکومت نے عورتوں کے لیے جینز کی ایک پتلون تیار کی ہے جیسے ہی کوئی مرد اس پتلون کو اتارنے کی کوشش کرے گا پولیس کو اطلاع ہو جائے گی وہ موقع واردات پر پہنچ جائے گی انسانیت تہذیب اخلاقیات یہاں تک پہنچ چکی ہے، ماڈرن ازم ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیتا ہے پہلے سوال کا جواب نہیں دیتا، وہ انسان کیوں پیدا ہوا، کہاں سے پیدا ہوا، کس نے پیدا کیا، جو عورت کی پتلون کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے، ایسے انسان پیدا کرتے رہو مگر جیسے ہی کوئی ہاتھ بڑھائے بس پولیس کو اطلاع ہو جائے ہم اسے پکڑ لیں گے۔

کینیڈا کے گھروں میں بچوں پر جنسی جسمانی تشدد عام ہے

کینیڈا میں بچے اپنے گھروں میں اپنے ماں، باپ اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں تشدد، جنسی تشدد اور ظلم وستم کا نشانہ بن رہے ہیں ۳۲٪ لڑکے لڑکیاں گھروں میں اپنوں کے ہاتھوں جسمانی اور جنسی دہشت گردی کا شکار ہیں، اس میں عورت مرد کا فرق بھی نہیں، ظلم کرنے والے بھی عورت مرد، ظلم سہنے والے بھی عورت مرد، لیکن صنفی امتیاز Gender Discirimination کا افسانہ دنیا بھر میں مقبول ہے اور سب سے زیادہ گالیاں صرف اور صرف مسلمانوں کو دی جاتی ہیں، گالیاں دینے والے کافر بھی ہیں، لبرل بھی، سیکولر بھی اور غامدی صاحب جیسے مغرب کے کامل مقلد اور متجدد بھی، اسلام کے خلاف سب کی آواز کی لے ایک ہی ہے نہ کم نہ زیادہ جناب جاوید غامدی صاحب اپنے اجتہادات کے ذریعے مغرب کے اسی ایجنڈے کی تکمیل فرما رہے ہیں۔

عورتوں کو مرد بنانے کے بعد عالمی خواتین کا دن منایا جاتا ہے

اب عورت Individual,Citizen,Human,Man ہے، مغرب نے آزادی اور مساوات کے نام پر خواتین کو مارکیٹ میں لا کر خاندانی نظام تباہ و برباد کرنے کے بعد عورت کو مرد بنانے کے بعد اس کچلی ہوئی، پسی ہوئی عورت کے حقوق کے لیے ۸/مارچ ۱۹۷۵ء کو خواتین کا عالمی سال قرار دیا، جدید دنیا میں عورت اپنے وجود سے بے زار ہو کر بالکل مرد جیسی ہو گئی ویسے ہی کپڑے پہننے لگی جب وہ نایاب ہو گئی تو اب ہر سال عورت کا دن منایا جاتا ہے، خواتین کا عالمی دن منانے کا مطلب یہ ہے کہ عورت اب سال میں صرف ایک بار موضوع سخن بنے گی کیونکہ عورت کا وجود ماڈرن ازم نے ختم کر دیا وہاں صرف Human ہوتا ہے فرد Individual ہوتا ہے، Citizen ہوتا ہے، جدید معاشرہ Civil Society ہوتی ہے، سب برابر ہیں یعنی Equality ہوتی ہے، لہٰذا عورت مرد تو سرے سے ہوتے ہی نہیں وہاں تو لوگوں کی شناخت صرف ان کے پیشے سے ہوتی ہے یہی سول سوسائٹی ہے۔

ریپ فری زون کے بجائے میرج فری زون بنائے جا رہے ہیں

یہ آزادی، مساوات ترقی جدید تعلیم مخلوط معاشرت کی اصل قیمت ہے، مغرب اور UNO امریکہ یورپ میں عورتوں کے لیے زنا

سے محفوظ علاقے Rape-free zones بنانے کے بجائے مغرب پاکستان میں شادی سے محفوظ علاقے Marriage-free zones بنانے کے لیے اربوں روپے خرچ کر رہا ہے، برطانیہ کے سابق وزیر اعظم گورڈن براؤن نے پاکستان کے دورے میں اعلان کیا ہے کہ مغرب کو کمسنی کی شادی قبول نہیں، ترقی کے ایمان اور عقیدے پر عمل کے لیے تعلیم ضروری ہے، لڑکیوں کی شادی تعلیم کی تکمیل سے پہلے نہیں کرنے دی جائے گی، اس کے لیے اربوں ڈالر کی امداد دی جارہی ہے مغرب کے لیے ترقی اہم ہے، اس کے لیے تعلیم ضروری ہے، کمسنی کی شادی مسئلہ ہے، کمسن سے زنا کاری مسئلہ نہیں ہے دوسرے معنوں میں گورڈن براؤن کا پیغام یہ ہے کہ تعلیم کے حصول کے دوران لڑکیوں سے زنا کاری ہوتی ہے تو ہو کوئی فرق نہیں پڑتا، ہر ایمان، عقیدے، یقین کی ایک قیمت ہوتی ہے، زنا روکنے کا بھی انتظام کریں گے مگر پہلے شادی کو روکیں گے تا کہ لڑکی تعلیم حاصل کر سکے بعد میں جبری زنا کو روکیں گے کیونکہ زنا اگر مرد عورت کی آزادانہ مرضی (Free Will) یعنی Mutal consent سے ہو تو یہ جائز ہے لیکن مرضی کے بغیر ہو تو ناجائز ہے کیونکہ آپ نے دوسرے کی آزادی چھینی ہے اصل جرم دوسرے کی آزادی کو پامال کرنا ہے، زنا کرنا جرم نہیں ہے زنا کسی کی مرضی کے بغیر کرنا (with out Consent) جرم ہے اصل عقیدہ آزادی ہے۔

مغرب میں عورت کی عفت، عزت، عصمت غیر اہم ہے، اس کی تعلیم و ترقی آزادی نوکری، خود مختاری، مردوں کے مساوی کام کرنے کی آزادی سب سے زیادہ اہم ہے، اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مغرب سے جنگ ایمان اور عقیدے کی جنگ ہے وہ مذاہب عالم کی ہزاروں سال کی متفقہ اخلاقیات کو تسلیم نہیں کرتا وہ اپنے باطل عقیدے کو علمی، عقلی، منطقی طور پر بھی ثابت کرتا ہے اور عقیدے کے اطلاق و نفاذ کے لئے عسکری قوت بھی استعمال کرتا ہے، برطانیہ کے سابق وزیر اعظم گورڈن براؤن مغرب کے عقیدے کا ایلچی ہے وہ کہتا ہے ہم پاکستان میں میرج فری زون بنائیں گے، براؤن فرماتے ہیں کہ کم عمری کی شادی سے بچیوں کا بچپن childhood چھین لیا جاتا ہے ہم اسکول جانے والی لڑکیوں کو شادی نہیں کرنے دیں گے اس کی آزادی چھین لیں گے مگر زنا کی آزادی دیں گے۔

لیکن براؤن صاحب یہ نہیں بتا رہے کہ مغرب میں لڑکی کی بلوغت کی عمر پانچ سال کم کرنے والی تہذیب، سائنس، ٹیکنو سائنس، صنعتی ترقی، سائنسٹرازم، سائنٹیفک امپریل ازم، آزادی کے فلسفے میڈیا، انٹرنیٹ، فیس بک، پورن انڈسٹری، انٹرٹینمنٹ انڈسٹری پورن کلچر کے خلاف کیا جدوجہد ہو رہی ہے، براؤن یہ بھی نہیں بتا رہے کہ امریکا یورپ میں کم سن بچیوں، لڑکیوں، فوجی سپاہیوں، اسی سالہ بوڑھیوں کے ساتھ اسکول، کالج، اولڈ ہوم، فوج میں جو جنسی دہشت گردی ہو رہی ہے اس کو روکنے کے لیے وہ (Rape Free / Sex Free Zone) کیوں نہیں بنا رہے؟ براؤن میرج فری زون کی بات کر رہے ہیں، لیکن براؤن کبھی نہیں کہے گا کہ ہم جنسی دہشت گردی سے آزاد علاقے Rape free zone بنا رہے ہیں، وہ کبھی نہیں کہے گا کہ ہم گناہ جرائم سے آزاد محفوظ علاقے Crime/Sin free zone بنا رہے ہیں، وہ کبھی نہیں کہے گا کہ ہم آلودگی، کینسر، ٹینشن، ڈپریشن، پاگل پن سے Free Zone بنا رہے ہیں کیونکہ یہ سب ترقی اور آزادی کے ثمرات ہیں ان کو برداشت کیا جائے گا، زنا کاری کو برداشت کیا جائے گا لیکن نکاح کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس سے عورت کی آزادی متاثر ہوتی ہے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں زیادہ بچے پیدا کرنے والے ملکوں سے لوگ مغربی معیار زندگی حاصل کرنے کے لیے غیر قانونی طور پر مغربی ملکوں میں داخل ہو جاتے ہیں لہٰذا تیسری دنیا، جنوب اور غیر

ترقی یافتہ ممالک کی عورتوں کے لیے آزادی اور ترقی کے نام پر یہی راستہ تجویز کیا ہے کہ پہلے تعلیم حاصل کرو دیر سے نکاح کرو، تعلیم کے عرصے میں اپنی فطری جبلی جنسی ضرورتیں رضامندی سے زنا کاری کے ذریعے پوری کرو یہی مغرب کا واضح ترین ایجنڈہ ہے لہٰذا آزادی کی راہ میں حائل ہر مذہبی، تاریخی، روایتی، سماجی، گروہی، عصبی، لسانی، نسلی، قبائلی، خاندانی قدر کو مٹا دیا جائے گا تاکہ آزادی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو سکے اس راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

پولیو کے قطروں کی طرح حمل سے بچانے کی ویکسین بھی جبراً پلائی جائے گی

تعلیم اہم ہے اور جدید دنیا میں جبری زنا سے بچنے کا راستہ بھی نہیں ہے یونیسکو نے افریقہ میں عورتوں کی تعلیم کے لئے کروڑوں ڈالر خرچ کئے، افریقہ کے کئی ملکوں میں لڑکیوں کی بھاری اکثریت نے تعلیمی اداروں میں داخلہ لیا مگر چند سالوں کے بعد لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہوگئی، تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسکولوں کے مرد اساتذہ نے لڑکیوں کو حاملہ کر دیا لہٰذا ماں، باپ نے لڑکیوں کو اسکولوں سے نکال لیا اور کم عمری میں ہی ان کی شادیوں کی روایت دوبارہ شروع ہوگئی، آج کی جدید دنیا میں ماس میڈیا، انٹرنیٹ، موبائل فون اور کمپیوٹر نے عورت کی عزت، عصمت، حرمت کو مٹا کر رکھ دیا ہے، اسلامی معاشروں میں بھی مذہبی عورت مغرب کے پیمانوں کے مطابق خود کو آرائش و زیبائش کا مجسمہ بنا کر شعوری و غیر شعوری طور پر sex symbols کے طور پر پیش کر رہی ہے، اسلامی معاشروں میں فیشن انڈسٹری نہایت تیزی سے پھیل رہی ہے، نکاح کا ادارہ اب محض عورت سے جنسی تعلق کو قانونی بنانے کا ادارہ بنا دیا گیا ہے، بیوٹی پارلر اسی لیے چل رہے ہیں مذہبی عورتیں بھی خود کو مغرب کے باطل دجالی معیارات کے مطابق مصنوعی طریقوں سے خوب صورت بنا کر پیش کرنے میں مصروف ہے اور دلیل صرف یہ ہوتی ہے اس میں کیا ہرج ہے؟ ظاہر ہے بہت ہرج ہے اسی لیے ہر ماں اپنے بیٹے کے لیے دنیا کی سب سے خوب صورت عورت ڈھونڈتی ہے اور اپنی کالی کلوٹی بیٹی کے لیے سب سے خوب صورت اور امیر شوہر تلاش کرتی ہے اسے شادی کی رات سب سے خوب صورت عورت بنا کر پیش کرتی ہے اگلے دن وہ اپنی اصل شکل میں آجائے گی یہ دھوکہ کی زندگی سب کو پسند ہے، جمالیات، میک اپ کو اہمیت دینے کا انجام sexism ہی ہوتا ہے خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، اس وقت اسلامی معاشرت اور تہذیب پر نزع کا عالم طاری ہے، زوال کی رات مزید گہری ہو رہی ہے دور دور تک نہ کوئی ستارہ ہے نہ بادبان کوئی انجم نہیں جو اس اندھیری رات میں اجالا کر دے اور اس امت کی تقدیر سنوار دے، جدید سیکولر اسکول میں تعلیم، جنسی آزادی، روشن خیالی اور آزادی کے عقیدے کے تحت دی جاتی ہے، اکثر مغربی ممالک کے اسکولوں میں کنڈوم مفت مہیا کئے جاتے ہیں بعض ممالک میں مباشرت کے لئے کمرے بھی مہیا کئے جاتے ہیں، یہ جدید ذلیل مغربی تہذیب ہے جسے غامدی صاحب جیسے محقق اپنی عقلی دلیلوں سے اسلامی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور مسلمان عورتوں کو بغیر محرم مرد کے تنہا ان گندے غلیظ علاقوں میں سفر کی اجازت دے رہے ہیں، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غامدی صاحب مغرب کے کتنے بڑے مقلد ہیں ان سے ہزار درجے بہتر تو سرسید تھے جو اسلام کو تہذیبی سطح پر خاص طور پر عورتوں اور خاندان کی سطح پر روایتی طریقے سے رکھنا پسند کرتے تھے، دنیا بھر کے اکثر تعلیمی اداروں میں زنا اتنا عام ہے کہ مغرب اب طالبات کو حمل سے بچانے کی ویکسین بنا رہا ہے جو لڑکیوں کو پولیو کے قطروں کی طرح جبراً پلائی جائے گی تاکہ جو لڑکی چاہے آزادانہ زنا کر سکے اور جس سے جبری زنا ہو، اسے حمل نہ ٹھہرے تاکہ تعلیم میں خلل واقع نہ ہو جبری زنا کاری اور حمل کے باعث ماں

باپ لڑکیوں کو تعلیم دلانا پسند نہیں کرتے اس جدید بے شرم ذلیل دنیا اور اس ذلیل مغرب کے بارے میں غامدی صاحب فرمارہے ہیں مسلم عورت ہر جگہ محفوظ ہے اور وہ ہر جگہ محرم کے بغیر سفر کرسکتی ہے۔

اسلامی متجددین: جاہلیہ یا جہل کا شکار ہیں

گزشتہ ایک صدی کی اسلامی تاریخ میں جتنے متجددین پیدا ہوئے ان کی اکثریت جاہلیہ اور جہل کی اصطلاح میں فرق کرنے سے قاصر ہے جہل عذر ہے اور عذر کی بنیاد پر کسی فرد کی مغفرت کا امکان ہے مگر جاہلیہ ایک عقیدہ، ایک نظریہ یقین اور متوازی دین ہے یہ عذر نہیں ہے لہٰذا اس میں مغفرت کا امکان نہیں ہے، ان متجددین نے اسلام کی مغرب کاری کرنے یا مغرب کی اسلام کاری کرنے کی بے پناہ کوشش کی لیکن نہ مغرب ان کی کاوشوں سے مطمئن ہوا نہ راسخ العقیدہ حلقوں نے ان کے تفردات کو قبول کیا، ان کی یہ ساری جدوجہد اکثر و بیشتر حمیت جاہلیہ کے ذیل میں آتی ہے، انہوں نے جانتے بوجھتے اسلامی علمیت کو عہد حاضر میں ناقابل عمل قرار دیا اور اسے قابل عمل بنانے کے لیے اسلام کی شکل ہی بدل دی، وہ متجددین جو روایت سے اپنا تعلق ختم نہ کرسکے، انہوں نے یہ فلسفہ تخلیق کیا ہے کہ اسلام کامل دین ہے اور اس کی کاملیت کا ظہور یہ ہے کہ وہ ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے لہٰذا اصل پیمانہ الحق زمانہ بن گیا جس پر اسلام کو پرکھا جائے گا، دوسرے معنوں میں مغرب کی ہوا جس طرف جارہی ہو اسلام کو بھی اسی طرف جانا چاہیے کشتی سمندر میں ہوا کے رُخ پر نہ چلے تو وہ ہمیشہ کھڑی رہے گی ساکن ہوگی اس کی حرکت باقی نہ رہے گی لہٰذا اسلام الحق نہیں رہا مرغ بادنما بنادیا گیا ہے جو بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلتا چلا جائے یہی اس کی لچک کمال ہے، سرسید کے علم کلام کا یہی اصول تھا جسے حالی نے ایک مصرعے میں سمودیا۔

ع چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

چند ایک متجددین کو چھوڑ کر اکثر جاہلیہ کا شکار ہیں، غامدی صاحب کے بارے میں فی الحال یہ رائے قائم کرنا مشکل ہے کہ حضرت والا جہل کا شکار ہیں یا جاہلیت کا، اس بارے میں اس کا بیان ہی معتبر سمجھا جائے گا، جناب جاوید غامدی عصر حاضر کے ایک ایسے متجدد اور مجتہد ہیں جو نہ اسلام کی علمیت، روحانیت، تہذیب، تاریخ سے پوری طرح واقف ہیں نہ جدید مغرب کے فلسفے اور اس کے پیدا کردہ نظام زندگی، نظام تہذیب اور نظام معاشرت سے واقف ہیں وہ جدید دنیا میں آنے والی جدید بھیانک، مہیب، ہولناک تبدیلیوں سے بھی واقف نہیں، وہ سرسید، عبدہ، احمد دین امرتسری، چراغ علی، امیر علی، خدا بخش کی طرح مغرب کو معیار اور پیمانہ بنا کر پورے عالم اسلام کو اسلامی علمیت، تہذیب و تاریخ کو مغرب کے پیمانوں کے مطابق آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، مغرب کے عقیدہ آزادی کو وہ ایک اسلامی عقیدہ کے طور پر قبول کرتے ہیں بے چارے یہ بھی نہیں جانتے کہ آزادی کا جدید مغربی عقیدہ بندگی اور عبدیت کی ضد ہے، سوال یہ ہے کہ آزادی کس سے (Freedom from) آزادی کس کے لیے (Freedom for) غامدی صاحب ان فلسفیانہ مباحث سے قطعاً واقف نہیں، لہٰذا وہ خطابت کے سوا کچھ نہیں کرتے اپنے الٹے سیدھے کچے پکے خیالات اپنی خوبصورت خطیبانہ صلاحیتوں کے ذریعے اس امت کے کانوں میں انڈیل کر ابہامات، التباسات، تناقضات اور تضادات کی حیران کن دنیا تعمیر کردیتے ہیں جس کی سیر کرنے والے اسلامی تاریخ، تہذیب، علمیت، شخصیات سے نفرت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

اسلامی علمیت، تہذیب، تاریخ، ثقافت کا یہ طے شدہ مسلمہ اجماعی اصول ہے کہ عورت محرم کے بغیر طویل سفر نہیں کرے گی اس اصول کی بنیاد پر بہت سی عورتیں امریکہ اور مغرب میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے نہیں جاسکتیں تھیں لہٰذا غامدی صاحب نے اس مسئلے کا ایسا اجتہادی حل پیش کیا ہے جس پر ان کی خدمت میں حرفِ ملامت کے سوا کچھ پیش نہیں کیا جاسکتا، غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''مقامات'' میں عورت کی تادیب کے عنوان سے نشوز پر عورت کو سزا دینے کے لیے شوہر کے اختیار کو ختم کر کے یہ اختیار عدالت، خاندان کے بزرگ کو منتقل کرنے کے لیے یہ سنہری اصول پیش کیا تھا کہ اصل چیز قرآن کا حکم ہے اس حکم پر عمل کرنے کا طریقہ جو قرآن نے خود بتایا وہ غیر اہم ہے، اس اصول کی تقریر غامدی صاحب نے میزان میں اس طرح کی ہے ''نشوز پر تادیب عدالت بھی کر سکتی ہے اور خاندان کے بڑے بزرگ بھی کر سکتے ہیں قرآن نے یہ حق شوہر کو بھی دیا ہے قرآن میں اللہ کی ہدایت پر عمل کے لیے یہ محض طریقہ کار کی تبدیلی ہے اس سے کوئی حکم معطل نہیں ہوتا، عورت کی اصلاح کے لیے سزا کوئی بھی دے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا'' (غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ص ۲۴۱)

لہٰذا قرآن کے کسی حکم پر عمل کا طریقہ جو قرآن سے یا ذات رسالت مآب ﷺ سے یا صحابہ کرام کے اجماع و تواتر سے یا امت کے تعامل، تواتر و اجماع سے ثابت ہو غیر اہم ہے اہم چیز حکم ہے حکم پر عمل کا طریقہ نہیں کیونکہ کسی بھی قرآنی حکم پر عمل کا طریقہ ہر زمانہ میں، ہر عہد میں، حالات و زمانہ کی رعایت سے تبدیل ہوسکتا ہے اسے تبدیل ہونا چاہیے بلکہ ہوتے رہنا چاہیے اصل چیز حکم کی روح ہے حکم کا طریقہ غیر اہم ہے حکم مطلق ہے طریقہ متغیر ہے۔

اسی اصول اجتہاد کی بنیاد پر انہوں نے عورتوں کو مردوں کے بغیر تنہا سفر کی اجازت عطا فرمادی اور اس اجازت کے لیے دینی احکامات قرآن و سنت، تاریخ و حدیث سے انہوں نے واضح انحرافات کیے، ظاہر ہے جب اللہ کے بتائے ہوئے قرآنی حکم پر عمل کا قرآنی طریقہ غیر اہم اور مطلق نہیں ہے تو رسول کے حکم پر عمل کے لیے رسول کا بتایا ہوا طریقہ بھی غیر اہم ہے مطلق نہیں ہے متغیر ہے رسول کا حکم یا بتایا ہوا طریقہ تبدیل بھی ہوسکتا ہے، منسوخ بھی ہوسکتا ہے۔ چوتھے اور پانچویں اصول کی تقریر وہ ''مقامات'' میں اس طرح کرتے ہیں ''نبی ﷺ کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورتوں کو محرموں کے بغیر سفر کرنے سے روکا، یہ سد ذریعہ کی ہدایت ہے، اس کے مخاطبین بھی افراد بحیثیت افراد ہیں، اس میں ریاست سے یہ تقاضا نہیں کیا گیا کہ وہ کسی عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں دے گی، پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ اس طرح کی ہدایات ہمیشہ حالات سے متعلق ہوتی ہیں، زمانہ رسالت کے حالات میں انھیں محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا جائے، اس زمانے میں سفر پیدل یا اونٹ گھوڑوں پر کیا جاتا تھا، مسافر تنہا یا قافلوں میں سفر کرتے اور بعض اوقات جنگلوں اور بیابانوں سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچتے تھے۔

اس طرح کے حالات میں عورتوں کی حفاظت کے پیش نظر اور انھیں کسی تہمت سے بچانے کے لیے پابند کیا گیا، دورِ حاضر نے اس کے برخلاف سفر کے ذرائع میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا ہے، مہینوں کا سفر اب گھنٹوں میں ہوتا ہے، ریل جہاز اور بسوں میں حفاظت کے غیر معمولی انتظامات ہیں، ہوٹلوں اور سرایوں وغیرہ کا نظم بھی بالکل تبدیل ہو چکا ہے، آج سے سو سال پہلے اپنی بہن یا بیٹی کو تنہا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھیجنے میں بھی تردد ہوتا تھا، لیکن اب یورپ اور امریکا کے سفر میں بھی (عورت کو تنہا بھیجتے

ہوئے)اس طرح کا کوئی تردد محسوس نہیں ہوتا، حج کا سفر بھی آخری درجے میں محفوظ ہو چکا ہے اور عورتیں اپنی شناسا عورتوں کی معیت میں نہایت اطمینان کے ساتھ حجاز مقدس جاسکتی ہیں، حالات کی یہ تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ حکم کو دور حاضر کے سفروں سے متعلق نہ سمجھا جائے (غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ص ۲۵۱، ۲۵۲)

اس عبارت سے غامدی صاحب کا یہ اصول بھی واضح ہو گیا کہ تمدن کی تبدیلی سے رسول کا حکم اور حکم پر عمل کا طریقہ تبدیل بھی ہوسکتا ہے، منسوخ بھی ہوسکتا ہے لہٰذا امریکا یورپ کا غیر مذہبی سفر عورت محرم کے بغیر تنہا کرسکتی ہے اور صرف حج کا مذہبی سفر شناسا عورتوں کے ساتھ ہی کرسکتی ہے، لہٰذا حکم تبدیل بھی ہوا اور منسوخ بھی ہو گیا، دوسرے معنوں میں مرد عورت کی زندگی سے لاتعلق کر دیا گیا عورت مرد جو روایتی، الہامی، مذہبی تہذیبوں میں ایک وحدت، اکائی تھے ماڈرن ازم کے فلسفے کے تحت دو الگ الگ وجود قرار دیئے گئے جو ایک دوسرے سے آزاد ہیں کوئی کسی کا ذمہ دار نہیں، غامدی صاحب نے اپنے اجتہاد سے مغرب کے عقیدوں آزادی، انفرادیت پسندی Individualism اور حق خود اختیاری Right of self determination کی اسلام کاری فرمادی ہے۔

منشور حقوق انسانی Human Rights Decleration میں جتنے بھی حقوق ہیں وہ صرف ایک فرد کے ہیں کسی برادری، گروہ، مذہبی اجتماعیت کے اجتماعی حقوق نہیں ہیں یہ منشور صرف فرد کو تسلیم کرتا ہے کسی اجتماعیت کو تسلیم نہیں کرتا لہٰذا منشور میں صرف اور صرف فرد کے حقوق (Individual Rights) کا تحفظ کیا گیا ہے اس لیے جب بھی کوئی فرد اپنی تاریخی، مذہبی، نسلی، لسانی، قبائلی، خاندانی اجتماعیت کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کرتا ہے تو ریاست اس فرد کی اجتماعیت کی آزادی (Freedom of collectivity) کے بجائے فرد کی آزادی (Freedom of individual) کا تحفظ کرتی ہے اور فرد کو اجتماعیت کے تصور خیر کے تسلط سے مکمل طور پر بچاتی ہے۔

اسی لیے ایک عورت اپنے گھر سے باپ کے پیسے، زیور لے کر بھاگ جائے خاندان کی عزت، اقدار، روایات، اسلامی شریعت کے اصولوں کو پامال کردے پاکستانی سپریم کورٹ کبھی بھاگی ہوئی عورت کے ہاتھوں ان اقدار، روایات، خاندان کے حقوق اجتماعیت کی بے عزتی اور شرعی قوانین کے قتل پر کوئی کاروائی نہیں کرے گی بلکہ بھاگنے کے اس عمل میں رکاوٹ ڈالنے والے خاندان، قبیلے، برادری، باپ بھائی کے خلاف کاروائی کرے گی اسے گرفتار کرے گی کیونکہ منشور حقوق انسانی کے تحت ریاست فرد کی اجتماعیت، برادری وغیرہ کے مقابلے پر فرد کی آزادی کے تحفظ کی پابند ہے۔

عدالت مجبور ہے اس کا دائرۂ اختیار یہی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتی یہ اسلامی قوتوں اور تحریکوں کی کم فہمی ہے کہ وہ اسی سپریم کورٹ سے نفاذ شریعت کے مطالبے کرتے ہیں آئین کے تحت شریعت کا نفاذ سپریم کورٹ کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے سپریم کورٹ کی شریعت مذہب حقوق انسانی ہے لہٰذا وہ اس شریعت کے مطابق فیصلے دے گی۔

چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے اپنے آخری فیصلے میں اِس اصول کے تحت ہر مسلم کو مرتد ہونے کی آزادی عطا فرمائی تھی، حاکم خان کیس میں جسٹس نسیم حسن شاہ نے بالکل درست لکھا تھا کہ آئین کے کسی حصے کو اس کے کسی دوسرے حصے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں لہٰذا ضیاء الحق کا یہ فیصلہ کہ قرارداد مقاصد آئین سے بالاتر (Supra Constitutional) ہے درست نہیں آئین کی تمام شقیں مساوی ہیں، یورپین کورٹ آف ہیومین رائٹس کے سو سے زیادہ فیصلوں میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ یورپ میں کسی بھی مذہب

والوں کو مذہب کے صرف اس حصے پر عمل کی اجازت ہے جو منشور انسانی حقوق کی شقوں کے منافی نہ ہوں پاکستانی سپریم کورٹ کا طریقۂ کار بھی یہی ہے وہ گھر سے بھاگنے والی لڑکی کے خلاف کبھی سوموٹو ایکشن نہیں لیں گے۔

حج کا سفر بھی آخری درجے میں محفوظ ہو چکا ہے اور عورتیں (محرم مردوں سے محرم عورتیں) اپنی شناسا عورتوں (محرم سے محرم عورتوں) کی معیت میں نہایت اطمینان کے ساتھ حجاز مقدس جاسکتی ہیں، حالات کی یہ تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ حکم کو دور حاضر کے سفروں سے متعلق نہ سمجھا جائے (غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ص ۲۵۱، ۲۵۲)

غامدی صاحب نے یہاں حج کے سفر کے لئے عورت پر شرط عائد کی ہے کہ وہ صرف مسلم شناسا عورتوں کے ساتھ سفر کرے گی کفار شناسا عورتوں کے ساتھ سفر نہیں کرے گی غیر شناسا مسلم عورتیں بھی نامحرم کے درجے میں ہیں لہٰذا غامدی صاحب نے صرف حج کے لیے مسلم غیر شناسا عورتوں کے ساتھ سفر کی اجازت نہیں دی، سوال یہ ہے کہ عورت کو شناسا عورتوں کے ساتھ سفر کا حکم کس نے دیا یہ قرآن میں کہاں بیان ہوا ہے، حلال وحرام کی حدود صرف قرآن طے کرسکتا ہے تو غامدی صاحب نے سفر حج کے لیے یہ قدغن قرآن کی کس آیت کے تحت لگائی؟ لیکن اسی مضمون میں امریکہ، یورپ کے سفر کے لئے انہوں نے عورت کو اس پابندی سے مستثنیٰ کر دیا ہے، مسلمان عورت یورپ امریکا اور دیگر ممالک کا سفر تنہا کرسکتی ہے اس سفر کے لیے نہ شناسا عورتوں کی ضرورت ہے نہ غیر شناسا عورتوں کی جس طرح کہ حج میں شناسا عورتوں کی شرط ہے کیونکہ یورپ وامریکا کے تنہا سفر کی اجازت اپنی بہن یا بیٹی کو دیتے ہوئے آج کسی کو جھجک محسوس نہیں ہوتی جب کہ آج سے سو سال پہلے مختصر فاصلے کے لیے بھی بیوی، بیٹی کو تنہا بھیجتے ہوئے ہر فرد تردد کرتا تھا غامدی صاحب آٹھویں اصول کی تقریر مقامات میں اس طرح کرتے ہیں:

> آج سے سو سال پہلے اپنی بہن یا بیٹی کو تنہا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھیجنے میں بھی تردد ہوتا تھا لیکن اب یورپ اور امریکہ کے سفر میں بھی (عورت کو تنہا بھیجتے ہوئے) اس طرح کا کوئی تردد محسوس نہیں ہوتا (غامدی، مقامات ۲۰۱۴ ص ۲۵۲)

غامدی صاحب مسلم عورت کو یورپ امریکا کا تنہا سفر کرنے کی اجازت دے رہے ہیں

جس امریکا، یورپ، کینیڈا، آسٹریلیا، مغرب اور بھارت میں عورت اپنے گھر میں اپنے باپ، بھائی، چچا، ماموں دیور، بیٹے، سسر سے محفوظ نہیں، جہاں محرمات سے جبری زنا Incest Relations عام ہے، جس ملک کے گھروں میں بیٹی، بیوی، بہو کی عزت محرم رشتہ داروں سے محفوظ نہیں ہے وہ عورت اپنے گھر میں جنسی دہشت گردی کا شکار ہے جس مغرب میں اسی سال کی بوڑھی عورت بوڑھے مرد سترہ سال کے لونڈوں لپاٹوں کی جنسی دہشت گردی سے محفوظ نہیں، جس کینیڈا میں بچے اپنے گھروں کے بڑوں کی جنسی دہشت گردی سے محفوظ نہیں، غامدی صاحب مسلمان عورتوں کو ان خبیث، ذلیل، بے شرم، ملکوں میں تنہا سفر کرنے کی اجازت کا فتویٰ دے رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا ان دنوں دماغی بوجھ کے باعث ان مسائل پر نہیں سوچ رہے۔

غامدی صاحب عہد رسالت کو عورتوں کے لیے غیر محفوظ قرار دے کر عورت کے طویل سفر کے لیے رسالت مآب ﷺ کی عائد کردہ محرم کے ساتھ سفر کی پابندی کا دفاع کرنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ آج کے جدید دور میں مسلم عورت کا یورپ وامریکا کا تنہا سفر کرنا بالکل جائز ہے آج کوئی اس سفر پر تردد کا اظہار نہیں کرتا (غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ص)

ظاہر ہے حضرت والا امریکا یورپ اپنے پڑوس بھارت کے حالات سے سرے سے ناواقف ہیں اور احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کینیڈا جیسے پرامن ملک میں عورت تو کیا گھروں میں بچے بھی جنسی ظلم و جبر سے محفوظ نہیں مگر غامدی صاحب تمام مسلمان عورتوں کو امریکا، یورپ، کینیڈا، بھارت، آسٹریلیا کا تنہا سفر کرنے کی اجازت دے رہے ہیں۔

مسلم عورت کا گھر سے نکل کر مارکیٹ میں آنا تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے

پردہ کا حکم اس عورت کے لیے ہے جو عذر شرعی پر گھر سے باہر نکلتی ہے، مساوات کے عقیدے نے انسان کو کس درندگی تک پہنچا دیا ہے، عورت سے جبری جنسی تعلقات (Incest Relations) یہ آزادی اور ترقی کی قیمت ہے، جس عورت کو اپنے گھر میں اپنے باپ بھائی چچا ماموں سے تحفظ حاصل نہیں اس عورت کو گھر سے بھاگنے کے بعد مغرب کا کون سا مرد سائبان مہیا کرسکتا ہے؟ یہ ذلیل تہذیب، یہ بے شرم تمدن، یہ بے غیرت بے حمیت ثقافت اقدار روایات اس جدید تعلیم اور آزادی مساوات ترقی کے عقیدے نے پیدا کی ہے اور عالم اسلام میں ان عقیدوں کی اسلام کاری ہو رہی ہے، حمزہ یوسف جیسے متجد دعقیدہ طحاویہ کی شرح میں ان عقیدوں کو اسلامی ثابت کر رہے ہیں، کینیڈا کے یاسر قاضی، امریکا کے ڈاکٹر طارق رمضان، ہندوستان کے وحید الدین خان، راشد شاذ، تیونس کے راشد غنوشی، سوڈان کے ڈاکٹر حسن الترابی، مصر کی جماعت حزب وسط، مصر کی جماعت النور، ترکی کے طیب اردگان، قطر کے شیخ الاسلام ڈاکٹر یوسف القرضادی، امریکا کے ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی وغیرہ عورت کو بغیر کسی شرعی عذر، کسی اہم ضرورت کے اپنا گھر چھوڑ کر ملازمت کرنے کے شرعی حیلے مہیا کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں مسلمان عورت کا بھی وہی انجام ہوگا جو مغرب کی عورتوں کا ہو چکا ہے ڈاکٹر حسن نصر کے بیٹے ڈاکٹر ولی رضا نصر نے اپنی کتاب Mecca nomics میں جس کا پرانا نام Islamic Capitalism تھا مغرب کو یہی مشورہ دیا ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کے نقاب، حجاب، ساتر، لباس، پر کوئی پابندی عائد نہ کرے اس طرح کی پابندیاں مسلم عورتوں کو اپنے تشخص اور شناخت کے بارے میں بہت زیادہ حساس کر دیں گی اس نے لکھا کہ اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ عورت اتنے بڑے پیمانے پر عوامی زندگی Public Life کا حصہ بن رہی ہیں اور اپنے گھر چھوڑ کر ترقی کی دوڑ میں شامل ہو رہی ہیں دوسرے معنوں میں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ان عورتوں کو حجاب، نقاب میں باہر نکلنے دو عنقریب یہ عورت مغرب کی طرح اپنا حجاب نقاب خود اُتار دے گی یہ ترقی کرتے کرتے آزاد ہوتے ہوتے خود لباس پہننے سے انکار کر دے گی اس پر پابندیاں لگا کر اسے اپنی مذہبی، ملی، اسلامی شناخت پر فخر کرنے کا موقع مت دو اسے اپنی تاریخ سے جڑنے کا موقع فراہم نہ کرو آزادی دو۔

ویسے بھی جو عورت مستقل مردوں میں رہتی ہے اس کی نسوانیت، نسائیت خود مجروح ہوتی ہے اس میں مردانہ رنگ کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں، ہمارے متجد دین نے مغرب میں تعلیم، ترقی، آزادی کے نام پر عورتوں کا انجام دیکھنے کے باوجود ترقی کے عقیدے کا انکار نہیں کیا، ترقی کی جاذبیت، جمال حسن ایسا ہے کہ پورا عالم اسلام مغرب کی ترقی کو نہایت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مگر اس ترقی کے نتائج کو خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول کے تحت دانستہ نظر انداز کر دیتا ہے۔

غامدی صاحب جو مجتہد بنے پھرتے ہیں ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ پردہ کا حکم ان عورتوں کے لیے ہے جو وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ پر عمل کرتی ہیں لیکن کبھی کبھی شرعی عذر، ضرورت، مجبوری سے گھر سے باہر نکلتی ہیں وہ عورت جو جان بوجھ کر، بغیر کسی ضرورت کے صرف

اورصرف کمانے، معیارزندگی بلند کرنے کے لیے چودہ چودہ گھنٹے گھر سے باہر رہتی ہے مردوں کے اندر رہ کر ہی خوش رہتی ہے اس کا پردہ کے احکامات سے کیا تعلق؟ غامدی صاحب مقامات میں فرماتے ہیں

> نبی ﷺ کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورتوں کو محرموں کے بغیر سفر کرنے سے روکا، یہ سدذریعہ کی ہدایت ہے۔اس کے مخاطبین بھی افراد بحیثیت افراد ہیں، اس میں ریاست سے یہ تقاضا نہیں کیا گیا کہ وہ کسی عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں دے گی، پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ اس طرح کی ہدایات ہمیشہ حالات سے متعلق ہوتی ہیں، زمانہ رسالت کے حالات میں انھیں محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا جائے، اس زمانے میں سفر پیدل یا اونٹ گھوڑوں پر کیا جاتا تھا۔مسافر تنہا یا قافلوں میں سفر کرتے اور بعض اوقات جنگلوں اور بیابانوں سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچتے تھے، اس طرح کے حالات میں عورتوں کی حفاظت کے پیش نظر اور انھیں کسی تہمت سے بچانے کے لیے پابند کیا گیا لیکن دور حاضر میں سفر کے ذرائع میں انقلاب آ گیا، ہوٹلوں سرائے کا نظام تبدیل ہو گیا اور اب یورپ امریکا کے سفر میں بھی (عورت کو تنہا بھیجتے ہوئے) اس طرح کا کوئی تردد محسوس نہیں ہوتا (غامدی مقامات ۲۰۱۴ ص ۲۵۲)

یعنی عورت کی عزت وعصمت رفعت کو اصل خطرہ سست رفتار ذرائع نقل وحمل سے تھا جب یہ علت باقی نہ رہی اور ان کی جگہ تیز رفتار ذرائع گاڑی، ریل اور ہوائی جہاز آ گئے تو یہ خطرہ ختم ہو گیا، یعنی بہ ظاہر خطرے کا اصل اور بنیادی سبب تہذیب، تمدن اور معاشرت کا رویہ نہیں آلات نقل وحمل تھے۔

لیکن اس مقدمے سے یہ استدلال بھی خود بخود نکلتا ہے کہ روایتی معاشرے اور روایتی سواریوں کو استعمال کرنے والے لوگ جنسی درندے تھے، جدید ترقی یافتہ سواریوں کو استعمال کرنے والے مہذب لوگ ہیں، یہ سول سوسائٹی ہے جو عورتوں کا بہت احترام کرتی ہے ماضی کے غیر ترقی یافتہ زمانے کے تمام مرد جاہل وحشی تھے، یعنی حضور ﷺ کے زمانے میں اور آج سے سو سال پہلے تک دنیا کے تمام مرد بدمعاش تھے، جدید زمانے کے مرد شریف ہیں، جدید تہذیب، جدید تہذیب کے مظاہر، سول سوسائٹی، تمام ہوٹل، سرائے، آلات سفر عورت کی عزت کے محافظ بن گئے ہیں، تاریخ انسانی کا محفوظ ترین معاشرہ جدیدیت نے پیدا کیا ہے، جبکہ یہ جھوٹ ہے اس سلسلے میں تمام اعداوشمار ہم پیش کر چکے ہیں، تاریخ انسانی میں اتنا خبیث ترین معاشرہ اور اتنی خبیث تہذیب نہ کبھی پیدا ہوئی نہ کبھی آئندہ پیدا ہو سکتی ہے، مغرب جیسی ذلیل ترین تہذیب سے زیادہ کسی تہذیب کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں لہٰذا فوکویاما اور ہٹنگٹن کا یہ فلسفہ، ادعا، بالکل درست ہے کہ تاریخ کا سفر ختم ہو گیا ہے تاریخ انسانی اس سے زیادہ غلیظ انسان پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
محقق، مفکر و دانشور، ہندوستان

اسلام کے عائلی قوانین پر عمل ضروری کیوں؟

اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ وہ ظالمانہ ہیں اور ان سے عورتوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسلام اور اسلامی قوانین و احکام کے متعلق طرح طرح کے من گھڑت قصے ایجاد کیے جاتے ہیں، اس طرح یہ ماحول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان قوانین کو تبدیل ہونا چاہیے، اس مناسبت سے یہ وضاحت کر دینی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام کے عائلی قوانین پر عمل کیوں ضروری ہے؟

مسلمان کسے کہتے ہیں؟

اس سلسلے میں پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ کیا جس شخص کا نام عبداللہ، عبدالرحمن، ذاکر اور وارث ہو، اسے مسلمان کہیں گے اور جن لوگوں کا نام رام، شیام، گوپال، ورما وغیرہ ہیں وہ مسلمان نہیں ہیں؟ کیا جن لوگوں کا ایک مخصوص لباس ہو، وہ کرتا پاجامہ اور ٹوپی لگاتے ہوں، وہ مسلمان ہیں اور جو اس طرح کے لباس نہ پہنتے ہوں وہ مسلمان نہیں ہیں؟ کیا جو لوگ گوشت کھاتے ہیں، یا گوشت کھانے پر اصرار کرتے ہیں، ان کو مسلمان سمجھا جائے؟ اور جو لوگ گوشت نہیں کھاتے یا اس پر اصرار نہیں کرتے ان کو مسلمان نہ سمجھا جائے؟ ظاہر ہے کہ ہمارا جواب نفی میں ہوگا، حقیقت میں مسلمان وہ ہے جو اسلام پر عمل کرتا ہو، اسلام کے لفظی معنی ہیں اپنے آپ کو حوالے کر دینا ''مسلم'' وہ ہے جو اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے حوالے کر دے اور انھوں نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔

مؤمن کسے کہتے ہیں؟

اسی طرح ایک دوسرا لفظ مؤمن ہے، مؤمن کے لفظی معنی ہیں ایمان لانے والا، مان لینے والا، گویا اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرے، خواہ اسے احکام کی حکمتیں معلوم ہوں یا نہ معلوم ہوں، اگر حکمتیں معلوم ہو جائیں تو بہت اچھی بات ہے، لیکن اگر نہ معلوم ہوں تو بھی وہ ان احکام سے منہ نہ موڑے اور یہ نہ کہے کہ جب تک ان احکام کی معقولیت میری سمجھ میں نہیں آئے گی، میں ان پر عمل نہیں کروں گا، قرآن مجید میں اس حقیقت کو بہت صاف الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (النور: ۵۱)

جب ایمان لانے والوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے اور ان کو یہ بتایا جائے کہ اللہ اور رسول کا یہ حکم ہے کہ تو ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی صورت جائز نہیں کہ وہ یہ کہہ دیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی، صرف وہی لوگ کام یاب ہیں۔

یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان ایک سماجی مخلوق ہے، سماج میں جو لوگ رہتے ہیں ان میں بسا اوقات بعض باتوں پر تنازعات ہو جاتے ہیں اور اختلافات سر ابھارتے ہیں، اہل ایمان سے کہا گیا کہ اگر تمہارے درمیان کبھی ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو تمہارے ایمان کا تقاضا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو، قرآن اور حدیث سے یہ جاننے کی کوشش کرو کہ ان اختلافات کا حل کیا ہے؟ پھر جو حل نکلے اسے قبول کرلو اور اس پر بے چوں و چرا عمل کرو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النساء: ۵۹)

اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

قرآن کریم کی ان دونوں آیتوں میں ایک بات مثبت انداز کہی گئی ہے، یعنی جو شخص ایمان اور اسلام کا دعوے دار ہو، اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرے، ان معاملات میں بھی جن کا تعلق تنازعات سے نہیں ہے اور ان میں بھی جن کا تعلق تنازعات و اختلافات سے ہے، لیکن جو شخص اسلام اور ایمان کا دعوے دار ہو، اس کے باوجود اپنے نفس کی پیروی کرتا ہو، اللہ اور رسول ﷺ کو جاننے اور ماننے پر تیار نہ ہو، ان کے بارے میں بھی قرآن کریم میں صاف الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

یہود و نصاریٰ کی دورنگی

یہود اور نصاریٰ کی پوری تاریخ یہی ہے کہ انھوں نے زبان سے تو یہی اقرار کیا کہ ہاں، ہم اطاعت گزار ہیں، ہم اللہ اور رسول کو ماننے والے ہیں، لیکن حقیقت میں انھوں نے خواہشات نفس کی پیروی کی اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو پس پشت ڈال دیا، قرآن نے صراحت سے کہا ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں، یہ لوگ ظالم ہیں، یہ لوگ فاسق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدۃ: ۴۴)

جو لوگ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں، وہ کافر ہیں۔

اگلی آیت میں کہا گیا ہے:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (المائدۃ: ۴۵)

جو لوگ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں، وہ ظالم ہیں۔

ان دو آیتوں میں یہود کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کو صاف الفاظ میں کافر اور ظالم کہا گیا، اگلی آیت میں نصاریٰ کا تذکرہ کیا گیا ہے اور انھیں فاسق قرار دیا گیا:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُوْلَـٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ (المائدة:۴۷)

جو لوگ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

ان آیات سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمان اور مومن کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرنا کیوں ضروری ہے؟ ضروری اس لیے ہے کہ اگر وہ اس پر عمل نہ کرے اور صرف زبانی جمع خرچ کرتا رہے تو پھر اس کے ایمان اور اسلام کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ

چودہ سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جس ملک میں بھی گئے اور جس زمانے میں بھی رہے، ان کی اکثریت نے اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش کی، کسی بھی ملک میں چاہے وہ اکثریت میں رہے ہوں یا اقلیت میں، انھوں نے اپنی زندگیوں میں اسلام کی تعلیمات کو نافذ کرنے کی کوشش کی، جن ممالک میں وہ اقلیت میں تھے، وہاں کے حکمرانوں سے انھوں نے اپنا یہ حق حاصل کرنے کی کوشش کی اور جن ممالک میں ان کا اقتدار قائم ہوا وہاں انھوں نے اسلام کی تمدنی اور سماجی تعلیمات، اسلام کے فوج داری اور دیوانی قوانین وغیرہ کو نافذ کیا، انھوں نے قضا کا محکمہ قائم کیا اور اسے انتظامیہ کے شعبے سے الگ رکھا، قاضی بسا اوقات حکم رانوں کے خلاف بھی فیصلہ کر دیتے تھے۔

انگریز سامراج کا تسلط اور اس کے اثرات

ہندوستان میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی، پھر جب یہاں سے مسلم حکمرانی کا دور ختم ہوا اور انگریزوں کا اقتدار آیا تو انھوں نے آہستہ آہستہ اسلامی قوانین کو ختم کرنا شروع کیا اور ان کی جگہ برطانوی قانون نافذ کیا، لیکن جب انھوں نے عائلی قوانین کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کی طرف سے زبردست احتجاج ہوا، پورے ملک میں اس کے خلاف تحریکیں چلائی گئیں، بالآخر ان مظاہروں اور تحریکوں کے نتیجے میں حکومت اس بات کی طرف مائل ہوئی کہ مسلمانوں کے جو عائلی قوانین ہیں، ان پر عمل کرنے کی انھیں آزادی ہونی چاہیے، چنانچہ ۱۹۳۷ء میں ایک ایکٹ پاس ہوا، جس کو شریعت اپلیکیشن ایکٹ کہا جاتا ہے، یہ وہی ایکٹ ہے، جسے آج ہم ''مسلم پرسنل لا'' کے نام سے جانتے ہیں، اس ایکٹ میں کہا گیا ہے کہ نکاح، طلاق، خلع، مباراۃ، فسخ نکاح، حضانت، ہبہ، وصیت اور وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات میں، اگر دونوں فریق مسلمان ہوں تو ان کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا، خواہ ان کا رواج اور عرف کچھ بھی ہو، قانون کو عرف و رواج پر بالادستی حاصل ہوگی۔

اس قانون پر ۱۹۳۷ء سے عمل ہوتا آرہا ہے، اگرچہ درمیان میں بعض ایسی مثالیں پائی جاتی رہی ہیں کہ ملک کی عدالتوں نے اس کے خلاف بھی کچھ فیصلے دیے ہیں، لیکن چوں کہ اس قانون کو تحفظ حاصل تھا، اس لیے ان فیصلوں کے خلاف بھی اپیل کی جاتی رہی، لیکن ادھر کچھ عرصے سے ہمارے سامنے یہ صورت حال آئی ہے کہ پورے مسلم پرسنل لا کو موردالزام ٹھہرانے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ کہا جانے لگا ہے کہ مسلمانوں کے عائلی قوانین بنیادی انسانی حقوق کے خلاف ہیں، اس سے آگے بڑھ کر یہ بات کہی جارہی ہے کہ یہ

قوانین عورتوں کے حق میں ظالمانہ ہیں، اس لیے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہندوستان میں رہنے والے ہر شہری کے لیے انسانی بنیادی حقوق کی ضمانت دے، جو لوگ ان ظالمانہ قوانین سے متاثر ہو رہے ہیں ان کو ان سے آزادی دے اور ان قوانین کو ختم کرے۔

شریعت اپلیکیشن ایکٹ پر اعتراضات کرنے والے

یہ اعتراضات کرنے والے تین چار طبقات ہمارے سامنے آتے ہیں: ایک تو عدلیہ کی طرف سے مستقل کچھ کچھ وقفے سے ایسے فیصلے کیے جا رہے ہیں جو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے مترادف ہیں، دوسری طرف حکومت کے بھی ارادے نیک نہیں ہیں، اس کی طرف سے بھی وقتاً فوقتاً ایسے اشارے دیے جاتے رہیں کہ وہ پرسنل لا ختم کر کے ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنا چاہتی ہے، اس کی وہ ترغیب دیتی ہے اور حکومت مسلسل منصوبہ بند طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے، تیسرا طبقہ ہمارے سامنے ان فرقہ پرست طاقتوں اور تنظیموں کا ہے، جو ہندو احیاء پرستی کی علم بردار ہیں، ان کو مسلمانوں کا مذہب، ان کی تہذیب، ان کی کوئی بھی علامت قابل قبول نہیں ہے۔ اس لیے وہ آنکھ بند کر کے اس کی برابر مخالفت کر رہی ہیں، بعض نام نہاد مسلمان بھی اس طرح کی رائے ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام کے قوانین آج سے چودہ سال پہلے کے لیے تھے، لیکن بدلتے ہوئے حالات میں ان کی نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت ہے۔

نام نہاد ماڈرن مغرب زدہ مسلمان

غیر مسلم اور ہندو احیاء پرست تنظیموں کے اعتراضات کا جواب دینا اور ان کا مقابلہ کرنا تو آسان تو ہے، لیکن جو لوگ نام کے مسلمان ہیں یا اسلام کا چولہ اوڑھ کر اسلامی تعلیمات پر کی جڑوں پر تیشہ چلانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان سے نمٹنا زیادہ سنجیدگی کا متقاضی ہے، اس تعلق سے ہمیں تین کام کرنے ہیں:

پس چہ باید کرد

سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم اپنے سماج کی اصلاح کی کوشش کریں، مسلمانوں کو صحیح مسلمان بنانے کی کوشش کریں، وہ لوگ جو اسلام پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر وہ اسلام کی بتائی تعلیمات پر صحیح طریقے سے عمل کرنے لگیں اور اپنے تنازعات جو ان کے درمیان ابھریں، ان میں پورے صدق دل کے ساتھ، اس بات پر آمادہ ہوں کہ ان کے سلسلے میں اللہ اور اور اس کے رسول کا جو فیصلہ ہوگا، چاہے وہ ان کے خلاف ہو، وہ اس کو قبول کر لیں گے، اگر مسلمانوں کی اصلاح ہو جائے اور ان کے اندر اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی آمادگی پیدا ہو جائے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

اصل مسئلہ یہی ہے کہ اصل تعلیمات کچھ اور ہیں اور مسلمانوں کا سماج کوئی اور دوسری تصویر پیش کر رہا ہے، یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ مسلم عورتوں پر بسا اوقات ظلم ہوتا ہے، لیکن جو لوگ ظلم کرتے ہیں وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے نہیں ہیں۔ اسلام کی تعلیمات کچھ اور ہیں اور مسلمانوں کا عملی رویہ کچھ اور ہے۔

اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی مہم

ضرورت کہ صحیح اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی مہم چلائی جائے، ظلم و زیادتی جتنے بھی واقعات پیش آتے ہیں، وہ اسلامی

تعلیمات سے ناواقفیت کے نتیجہ میں ہوتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ موجودہ وقت میں تین طلاق کے مسئلہ کو بہت زیادہ ابھارا جارہا ہے، اسلام نے طلاق کا جو تصور دیا ہے، وہ بہت حکمت اور عورت کے حق میں رحم پر مبنی ہے، جن مذاہب میں طلاق کا تصور نہیں ہے، ان میں ایک بار نکاح ہونے بعد علیحدگی کی کوئی صورت نہیں ہے، ان میں عورتوں کو ساتھ نہیں رکھا جاتا، بلکہ مختلف تدبیروں سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ کسی عورت کو ناحق قتل کر دینا اچھا ہے یا اس کو آزاد کر دینا؟ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے نباہ ناپسندیدگی عورت کے ساتھ ممکن نہ ہو تو طلاق دے دی جائے، تاکہ مرد اور عورت اپنا دوسرا نکاح کر لیں اور نئی زندگی کا آغاز کریں۔

آج اسلام کی تعلیمات پر جو اعتراضات ہو رہے ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے ان پر صحیح طریقے سے عمل نہیں ہو رہا ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ ہم مسلم سماج میں بیداری لائیں، ان کے درمیان صحیح اسلامی تعلیمات پیش کریں، ان سے یہ کہیں کہ اگر آپ اسلام کو مانتے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ آپ مسلم ہیں تو آپ کو اسلامی پر عمل کرنا ہوگا۔ اس طرح مسلم معاشرے کی اصلاح ہوگی تو یہ تمام اعتراضات ختم ہو جائیں گے۔

اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے شعور بیدار کرنا

دوسرا کام ہمارے کرنے کا یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں یہ شعور بیدار کریں کہ قرآن کا یہ صریح حکم ہے کہ تم اپنے تنازعات کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لے جا کر حل کرو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو تمہارے مسلمان ہونے کا کوئی اعتبار نہیں، جو لوگ ایمان اور اسلام کا دعوی کرنے کے باوجود بھی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق اپنے معاملات کو حل کرنے کے بجائے دوسروں کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ لوگ قرآن کی نظر میں ظالم ہیں، کافر ہیں اور فاسق ہیں، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اگر تنازعات پیدا ہوں تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کیا جائے اور غیر اسلامی افراد اور دیگر پنچایتوں کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔

اسلامی تعلیمات کی معقولیت واضح کرنا

تیسرا کام ہمارے کرنے کا یہ ہے کہ صحیح اسلامی تعلیمات سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے غیر مسلموں کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں جو اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ ان کو ہوا دینے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی معقولیت واضح کریں، ان کی حکمتیں بیان کریں تاکہ لوگوں کے ذہن صاف ہوں اور جو شدت پسند لوگ، لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں وہ اس میں ناکام ہوں، ان تینوں محاذوں پر کام کیا جائے تو ان شاء اللہ اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں وہ دور ہوں گی، اعتراضات کا بھی ازالہ ہوگا اور اسلام کا صحیح پیغام دوسرے انسانوں تک پہنچے گا۔

☆☆☆

مولانا محمد طفیل قاسمی
مدیر سہ ماہی المظاہر کوہاٹ

دینی مدارس کا عصری نظام تعلیم سے اشتراک والحاق

تنقیدی جائزہ

اہل علم پر واضح ہے کہ مسلمانوں کے بنیادی تعلیمی مآخذ قرآن وسنت ہیں، اُن کو سامنے رکھ کر ائمہ دین نے انفرادی واجتماعی زندگی کے اُصول وفروع مستنبط کیے، اسی سے ''فقہ'' کو وجود ملا، جسکی آبیاری دور نبوت ہی سے خود حضور ﷺ نے فرمانا شروع کی اور صحابہ کرام خصوصاً خلفائے راشدین اس کی ارتقا میں پیش پیش رہے، مسلمانوں کا ''نظم مملکت'' پوری شرح وبسط سے کتب فقہ میں مذکور تھا، انکے وزارتی، عدالتی، اقتصادی اور عسکری شعبہ جات اسی سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، دوسری طرف افراد کی معنوی تربیت اس درجہ کامل تھی کہ بظاہر سادگی کا مرقع نظام بھی ان کے ہاتھوں بارآور اور انتہائی ثمرہ خیز ثابت ہوتا، اس دوران اسلامی حکومتوں نے زندگی کی لازمی ضرورتوں مثلاً فن طب، تعمیر، حرب وضرب اور سائنس کے حصول وترویج میں بھی کوئی تساہل نہیں برتا، اسلامی خلافتوں میں ابتدائی تعلیم وحدت ویکسانیت سے آراستہ تھی، درسگاہوں میں ثنویت کا تاثر نہیں تھا، اپنے لیے طب اور تعمیر کو میدان بنانے والے بھی اتنے ہی پکے مسلمان ہوتے تھے جتنے مذہبی رہنمائی سرانجام دینے والے علما۔ کیونکہ ان کی بنیادوں میں قرآن وسنت کی روحانیت کا خمیر تھا، جس نے اُنہیں ہر موڑ پر ''اللہ والا'' ہی بنا کر رکھا(۱)

امت مسلمہ استعماری غلبے کے بعد

تاہم استعماری طاقتوں کے غلبے کے بعد اسلامی نصاب کی وحدت اور جامعیت برقرار نہ رہ سکی، چونکہ استعمار کے پیش نظر محض مادی زندگی کا تصور تھا، اس لیے اُس نے زندگی کی لازمی ضرورتوں کے لئے تخلیق شدہ فنون (طب، تعمیر، حرب، سائنس وغیرہ) کی ایسی تجرید وتدوین کی کہ اُن میں اسلامی ثقافت، تہذیب، تمدن اور فلسفہ حیات کی رمق بھی باقی نہ رہے، ان فنون کا محاورہ، ان کی تحصیل کی زبان، ان کی خارجی تطبیق اور نصابوں پر اپنی تہذیب اور فلسفہ مادیت کے گہرے اثرات اور نقوش ثبت کر دیئے، جو ایک بڑے حادثے اور المیہ سے کم نہ تھے۔

تعلیم پر استعمار کی اجارہ داری

اس سے بڑھ کر خطرناک صورت حال ''جو شاید عالم اسلام کو اپنی زبوں حالی کی تاریخ میں کبھی پیش نہ آئی ہو'' یہ سامنے آئی کہ مسلمانوں کی معاشرتی اور تمدنی ساخت وپرداخت کے لیے ضروری تعلیم بھی استعمار کا اوّلین نشانہ بن گئی، عالم اسلام پر فتنہ تاتار سے

کڑا وقت شاید ہی آیا ہو لیکن اس میں بھی مسلمانوں کی معاشرتی ساخت ''اسلامی'' رہی کیونکہ مسلمان معاشرہ کو تتر بتر کرنے کے لیے تاتاریوں کے پاس کوئی نیا نصاب تعلیم، ثقافت اور تہذیب جدید نہ تھی، اس کے برعکس انگریزی استعمار نے جہاں عالی فنون پر اپنی تہذیبی اجارہ داری قائم کی، وہاں معاشرہ کی عدالت، درسگاہ، دفتر اور تمدن کی نقابت وسیادت سے ''اسلامیت'' کا جنازہ نکالنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، ہندوستان پر قبضے کے استحکام کے بعد مکتب و مدرسہ کا اثر معاشرے سے مٹانا اوّلین ہدف قرار پایا، مشرقی ثقافت کی پامالی اور مغربی تہذیب کی برتری جتلانے کے لیے باقاعدہ عرف ورواج تبدیل کیے گئے پگڑی جو اعزاز کی علامت اور مسلمانوں کے لباس کا حصہ تھی اُسے ڈوموں کا اختصاصی لباس بنایا گیا اور ننگے سر والے شرفا باور کرائے گئے، مشرقی واسکٹ ہوٹل کے بیروں کو پہنائی گئی اور مغربی ہیٹ وجیکٹ فیشن قرار پائے، انہوں نے ہندوستان کا انتظامی، مالیاتی اور عدالتی نظام مکمل طور پر بدل لیا اور اس نئے نظام کو چلانے کے لیے کل پرزوں کی تشکیل کا مسئلہ لارڈ میکالے (م:۱۸۵۹ء) کے پیش کردہ نظام تعلیم سے حل کرنے کی منصوبہ بندی کی، گویا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ طب وتعمیر اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو پڑھنے والے تو اسلامیت سے عاری نصاب میں پرورش پائیں گے ہی سہی! معاشرے کا نظام چلانے والے جج، وکیل، پولیس، اُستاد، پٹواری اور دفتری ملازم بھی لارڈ میکالے کے نظام سے پروان چڑھیں گے، لارڈ میکالے کا نظام کیا تھا؟

لارڈ میکالے کا منصوبہ

۱۸۳۴ء میں لارڈ میکالے کی صدارت میں ایک تعلیمی کمیٹی بنائی گئی جس کا پہلا اجلاس ۷ مارچ ۱۸۳۵ء میں ہوا جس کا مقصد ہندوستانیوں کو فکری طور پر انگریز بنانا تھا، اسکی اسکیم یہ تھی کہ اس نظام سے جو نسل تیار ہوگی وہ چمڑے اور چہرے کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن دل و دماغ کے اعتبار سے انگریز ہوگی (۲) مسلمان اپنی دینی حمیت کے پیش نظر اس نظام میں داخل ہونا عیسائی ہونے کے مترادف سمجھتے تھے اور واقع بھی یہ تھا کہ اس نظام سے استفادہ کرنے والے اکثر لوگ الحاد کی دلدل میں پھنس کر مذہب سے دور ہو جاتے، مسلمانوں میں سرسید احمد خان پہلے شخص تھے جو انگریزی نظام تعلیم کے پرجوش داعی کی شکل میں سامنے آئے، آپ نے اپنی کتاب تہذیب الاخلاق میں مسلمانوں کے مسائل کا حل مغربی تہذیب اور تعلیم کو قبول کرنا ٹھہرایا، آپ نے سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں مراد آباد کے اندر ایک سکول قائم کیا، پھر ۱۸۶۴ء میں غازی پور کے اندر ایک سکول کا سنگِ بنیاد رکھا، بالآخر ہندوستان میں ایک جدید یونیورسٹی کے قیام کی غرض سے یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ یورپ تشریف لے گئے اور طویل عرصہ کے بعد لوٹ کر ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی (۳)

مادیت پرستی پر مبنی تعلیم

سرسید احمد خان نے یہ عذر پیش کیا کہ اگر ہم اس نظام کو قبول نہ کریں تو معاشرے کے انتظامی ڈھانچے اور مادی ترقی میں مسلمان پیچھے رہ جائیں گے، ہوسکتا ہے اُن کی یہ سوچ مبنی بر اخلاص ہو لیکن آنے والے وقت نے اس کاوش کی تغلیط کی، کیونکہ اس نظام کے فضلا میں پوری اسلامی ساخت محفوظ نہ رہ سکی، لارڈ میکالے کے نظام کا بنیادی فلسفہ ''مادیت پرستی'' پر مبنی تھا، اس میں زندگی کے

جملہ نظاموں کو عقل و مادہ کی کسوٹی پر پرکھنے اور چلانے کی سوچ کارفرما تھی، اس سے فکری بے راہ روی، ایمان وعقیدے میں تزلزل، عبادات میں تساہل وتشکیک وتردید کا رویہ، معاملات میں خودغرضی اور مفاد پرستی اور اخلاقیات کی پامالی کا قوی اندیشہ تھا، جو بعد میں حقیقت بن کر سامنے آیا، غرض یہ ایک ''فکری ارتداد'' کی لہر تھی جو پوری قوت سے مسلمانوں کی نسل درنسل تباہی کے لیے چل پڑی تھی، ان حالات میں ہندوستان کے اہل دانش اور اہل درد کے سامنے دو ہی راستے تھے، پہلا یہ کہ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کو انگریزی استعمار اور اُسکی تہذیب کے ترجمانوں کی رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ بات اُن کی حمیتِ دینی کے خلاف تھی اور استعمار کے خلاف مسلح جہاد تک کرگزرنے والے اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند قیام

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اسلامی معاشرہ کی پرانی قدروں کو محفوظ رکھنے کے لئے کمر ہمت باندھ لیں، اس کے لئے بنیادی ضرورت مضبوط نظام تعلیم کی تھی، لیکن بات واضح تھی کہ مغلوب ومقہور قوم کے لیے اعلیٰ علوم وفنون کے واسطے وسائل، درسگاہیں اور ماہرین فن اپنی روایات واقدار کا پاس رکھتے ہوئے نچلی سطح پر مہیا کرنا ناممکن تھا، صرف اسی قدر کام ہوسکتا تھا کہ وہ اسلامی معاشرہ میں ''اسلامیت'' کی رمق باقی رکھنے، قرآن وسنت کی تعلیم کو رواج دینے، مذہبی تشخص کی بحالی اور بالاتری قائم کرنے، عام مسلمانوں کی دینی اور مذہبی رہنمائی اور طوفان مغرب سے اُن کے افکار ونظریات کی حفاظت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں، اس مقصد کے لئے مولانا قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء میدان میں آئے اور ۱۸۶۶ء میں قصبہ دیوبند میں ایک عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی، یہ حضرات ہندوستان کے قدیم سرکاری نصاب تعلیم ''درس نظامی'' کے فیض یافتہ تھے، اس لئے انہوں نے درس نظامی ہی کو اپنے یہاں رائج کیا، گو کے درس نظامی میں محدود علوم وفنون کی تعلیم تھی، لیکن یہ بات اُس وقت بھی مشاہدہ میں تھی اور ڈیڑھ صدی کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ درس نظامی نے اسلامی معاشرے کی ساخت کو قائم رکھنے اور نظریاتی مسلمان پیدا کرنے کا کارنامہ ''باوجود اس کے کہ تہذیب مغرب کو سیاسی غلبہ حاصل تھا'' پوری قوت سے سرانجام دیا(۴)

نظام تعلیم کی دوئی اور ثنویت

اس مرحلے پر بعض دانشور حضرات مسلمانوں کے نظام تعلیم کو دوئی اور ثنویت کا شکار کرنے کی پوری ذمہ داری مولانا قاسم نانوتویؒ اور سرسید مرحوم پر ڈالتے ہیں، کہ ان دو حضرات کا متضاد سمت میں سفر تفریق کا باعث بنا اور مسلمانوں کی تعلیمی وحدت پارہ پارہ ہوئی، لیکن اس بات سے اتفاق ممکن نہیں، بلکہ اُس وقت کے خاص حالات کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے تو دونوں حضرات نے اپنی اپنی فکر کے مطابق دفاعی پوزیشن میں یہ محاذ سنبھالے اور غالباً کسی کے ذہن میں ثنویت کا تصور نہ تھا، بات بالکل دوٹوک اور واضح تھی کہ مولانا نانوتویؒ کے ہاں سرسید احمد خان کا ''جدید نظام تعلیم'' سرے سے قابل قبول ہی نہ تھا اور نہ ہی وہ اسے اسلامی معاشرہ کی بقا اور ترقی کے لیے کارگر سمجھتے تھے، اُن کی نظر میں یہ اسلامی نظام تعلیم وتربیت کے متوازی ایک نیا نظام تھا، اہل انصاف بخوبی جانتے ہیں کہ سرسید اور ان کے فضلاء باعتبار عقائد وخیالات، باعتبار نظریات واعمال اور باعتبار اوضاع واطوار مغربی تہذیب اور فلسفہ فکر سے محفوظ نہ

رہ سکے، چونکہ مولانا نانوتویؒ اور اُن کے حلقہ فکر کو ان اثرات بد کا اچھی طرح اندازہ تھا، اسی لئے وہ عصری فنون کے لئے اسے ''معیاری نظام'' نہیں سمجھتے تھے، اُنکے ہاں معاشرے کی اسلامی ساخت برقرار رکھتے ہوئے عدلیہ، مقننہ، اقتصاد، مالیات اور سیادت کی ذمہ داری فضلائے درس نظامی بھی انجام دے سکتے تھے جیسے کہ مغلیہ حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں ہوتا رہا، لیکن انگریز نے اپنے نظام کو مسلط کر کے اُن کے لئے یہ سب ناممکن بنا دیا تھا، اب انگریز کے وضع کردہ نظام کو چلانے کے لئے انگریزی نظام تعلیم سے گزرنا اُن کے ہاں کھلے بندھوں شکست کا اعتراف اور معاشرتی موت کو قبول کرنا تھا، جس کے لیے وہ تیار نہ تھے، لہٰذا اُن کے ہاں اسلامی معاشرہ میں جدید وقدیم کی کوئی تقسیم نہ تھی، بلکہ یہ تقسیم انگریز نے اپنی تہذیب کے ہمدرد پیدا کر کے خود ہی کی۔

مولانا نانوتوی اور مقابلہ مغرب

غالباً مولانا نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کے ہاں مسئلے کا حل یہ نہیں تھا کہ وہ انگریز کے لائے ہوئے نظام کا کل پرزہ بننے کے لیے پورے اسلامی معاشرے کو ایک ایسے نظام تعلیم میں جھونک دیں جہاں مذہبی تعلیم کی محض اتنی سی پیوندکاری ہو جس میں تہذیب مغرب اور فلسفہ جدید کے اثرات بد کی مقاومت اور مقابلہ کی طاقت ہی نہ ہو بلکہ ان کے ہاں مسئلے کا دائمی حل انگریزی اقتدار کو توڑ کر تہذیب مغرب کے اثرات سے آزاد خالص اسلامی نظام کا قیام تھا، اسی تناظر میں انکے حلقہ فکر نے کسی بھی دور میں برصغیر سے انگریزی اقتدار کے مکمل خاتمے سے چشم پوشی نہیں برتی اور تحاریک آزادی میں انکی سعی پیہم اور جہد مسلسل سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں(۵) اور نہ ہی ان کے ہاں یہ بات اہمیت کی حامل تھی کہ نصاب قدیم کا تحفظ وتسلسل برقرار رکھتے ہوئے اس میں جدید کی پیوندکاری کی جائے، کیونکہ انگریز کی موجودگی میں یہ سب اس کی تہذیب اور نظام کی جزوی افادیت تسلیم کرنے کے مترادف تھا، جو انکے ٹھوس اور محکم نظریات کے بالکلیہ خلاف تھا۔

مولانا نانوتوی کی جدید نظام تعلیم کی پیوندکاری سے گریز

بعض اہل دانش کو یہ بات بھی کبیدہ خاطر کر دیتی ہے کہ مولانا نانوتویؒ اور ان کے حلقہ فکر کا یہ رویہ تشدد آمیز تھا، ان کے بزعم اگر وہ اپنے نظام میں جدید کی پیوندکاری کر کے انگریزی نظام کے بعض مثبت پہلوؤں کو قبول کر لیتے تو شاید مسلمانوں کی بہتری ہوتی، اس پر میں ممتاز مفکر ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم کی ایک بات کا حوالہ دوں گا، فرماتے ہیں:

> میرے خاندان کے ایک بزرگ تھے حافظ محمد اسماعیل، جو بڑے عالم اور محدث تھے، مولانا ادریس کاندھلویؒ کے والد تھے اور رشتے میں میرے والد کے چچا تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں کسی انگریز کی شکل نہیں دیکھی، انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنے گھر میں کسی کو انگریزی لفظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی، ہندوستان میں پہلے شاید ٹماٹر نہیں ہوتا تھا، بعد میں جب یہاں ٹماٹر آیا تو یہ لفظ شاید انگریزی کے tomato کی اردو شکل تھی، حافظ اسماعیل صاحب ٹماٹر کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے اور کوئی یہ لفظ بولتا تھا تو اس پر ناراض ہوتے تھے، انہوں نے اس کا نام لال بینگن رکھا ہوا تھا، میرے والد صاحب بتاتے تھے کہ ایک دن گھر میں انہوں نے پوچھا کہ سالن میں کیا ڈالا ہے؟ ان سے کہا گیا کہ ٹماٹر ڈالا گیا ہے تو سخت ناراض ہوئے کہ نصرانیت میرے گھر میں گھس آئی؟ اس کو لال بینگن کیوں نہیں

کہتے؟ بظاہر یہ بات آج ہمیں لطیفہ معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر مسلمانوں میں کچھ لوگ اتنی شدت کے ساتھ مغربی اثرات میں رکاوٹ پیدا نہ کرتے تو مغربی اثرات آج سے سو سال پہلے اسی طرح لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے جیسا کہ آج گھستے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں(۶)

مولانا نانوتوی کا مسلمانوں پر احسان

لہٰذا مولانا نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کا اس شدت سے انگریزی نظام کی مزاحمت برصغیر کے مسلمانوں پر احسان ہے، جس سے آج معاشرہ میں دینی روح بڑی حد تک باقی ہے، اگر وہ اس قوت سے مقاومت کا فرض انجام نہ دیتے تو آج ہماری معاشرتی تاریخ کچھ اور ہوتی، کچھ اہل دانش اس مرحلے پر کہتے ہیں کہ ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کے بعد وحدت نظام تعلیم کی سعی کیوں نہیں کی گئی؟ اس کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے۔

اسلامی تحریکات سے امیدیں

یہ بات واضح ہے کہ آزادی کی تحریکات سے امید قائم تھی کہ اسلامی سلطنت کے قیام سے یہ خواب بھی پورا ہو جائے گا کہ اسلام کے نظام وزارت، عدالت، اقتصاد اور مالیات وغیرہ کی بحالی کے ساتھ ساتھ اسلام کا قدیم نظام تعلیم بھی جدید علوم کو ضم کر کے اپنے حقیقی طمطراق سے ایک دفعہ پھر قائم ہوگا، اس سے جہاں فقیہ و محدث اور داعی و صوفی جنم لیں گے وہاں سائنس و طب اور فلسفہ و ریاضی کے شناسا بھی پیدا ہوں گے، جو قلب و قالب کے اعتبار سے پکے ٹھکے مسلمان، محب وطن، اسلامی اقدار و روایات کے خوگر اور اسلام کے نشاۃ ثانیہ کے امین ہوں گے، اسی کے لیے ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کا نعرہ لگا، لیکن پاکستان کے قیام کے بعد پوری کوشش کے باوجود کوئی بھی نظام مکمل طور پر اسلامی نہ ہو سکا، وطن خداداد کی تشکیل کے بعد علماء کی کوشش رہی کہ ملک میں مکمل اسلامی نظام قائم ہو اور اہل علم و دانش کی مشاورت سے حکومت سارے نظام اپنی سرپرستی اور نگرانی میں چلائے، لیکن یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

چھ مسلم زعماء کی کمیٹی

تحریک پاکستان کی زعماء کی کوششوں سے اسلامی آئین کی تدوین کا کام آزادی سے قبل ہی شروع ہو گیا تھا، اس ضرورت کے تحت آئین کا خاکہ مرتب کرنے کی غرض سے چھ مسلم زعماء کی ایک کمیٹی بھی بنی تھی جن کے اسمائے گرامی یہ تھے ☆ مولانا سید سلیمان ندوی ☆ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ☆ ڈاکٹر ذاکر حسین خان ☆ مولانا آزاد سبحانی ☆ نواب سعید احمد خان چھتاری ☆ مولانا ابو اعلیٰ مودودی، دو نوجوان علما مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا اسحاق سندیلوی اس کمیٹی کے معاون رکن بنائے گئے، اس کمیٹی نے گہرے غور و خوض کے بعد ۱۹۴۵ء میں اسلامی آئین کا خاکہ تیار کیا، یہ ۲۷ نکات پر مبنی تھا(۸) لیکن واضح ہے کہ اس کے عملی نفاذ میں تعطل ہی رہا، قیام پاکستان کے بعد مختلف مکاتب فکر کے ۳۱ علماء کی نمائندہ کمیٹی بنی، جس نے اسلامی نظام کی تشکیل کے لیے ۲۲ نکات پر مبنی سفارشات تیار کیں، ۱۹۵۴ء کی دستور سازی میں ان کو اطمینان بخش حد تک سمونے کی کوشش کی گئی تھی، اور اُس کی آخری خواندگی

باقی تھی کہ گورنر جنرل غلام محمد نے اپنی لادینیت پسندی کی وجہ سے دستور ساز اسمبلی ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو تحلیل کر دی(۸) قیام پاکستان کے فوری بعد بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت پر پہلی تعلیمی کانفرنس ۲۷ نومبر یا یکم دسمبر ۱۹۴۷ء کو وزیر تعلیم فضل الرحمن کی زیر صدارت ہوئی، اس کانفرنس کے تحت پاکستانی نظام تعلیم کو اسلامی نظریہ حیات سے ہم آہنگ کرنے اور اسکولز اور کالجز میں دینی تعلیم کا فیصلہ کیا گیا(۹)

ان تمام ابتدائی کوششوں کے باوجود تحریک پاکستان میں شامل اہل علم کو کوئی مثبت پیش رفت ہوتی دکھائی نہیں دی، استاد محترم مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہم انہی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لیکن اس کے لیے عملی اقدامات کی نشاندہی کی گئی اور نہ ہی دینی مدارس اور جدید عصری اداروں کی دوری ختم کرنے کی کوئی قابل عمل و قابل قبول پالیسی دی گئی جبکہ تحریک پاکستان میں حصہ لینے والے علماء کو توقع تھی کہ جدید و قدیم دونوں کو ایک کر کے ایک ایسا جدید نظام تعلیم یقیناً مرتب کیا جائے گا جس میں دین و دنیا دونوں کے علوم متناسب مقدار میں جمع کر دیئے جائیں(۱۰)

دارالعلوم دیوبند کے طرز پر مدارس کا قیام

جب علمائے کرام نے اس سرد مہری کا مشاہدہ کیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ معاشرے کی اسلامی ساخت کو برقرار رکھنے، اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ، مغربی تہذیب و ثقافت اور فکر و فلسفہ کے سد باب، دینی علوم و فنون کی بقا و ترویج اور مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کے واسطے اس نئے نظام تعلیم میں کوئی عملی اور مؤثر قدم اٹھانا ناممکن ہے تو انہوں نے اپنے سابقہ طرز عمل کے موافق دفاعی پوزیشن اختیار کر لی اور دارالعلوم دیوبند کے طرز پر مدارس کے قیام کو ناگزیر جانا، جہاں مغربی تہذیب و ثقافت اور اسکے اثرات بد سے مکمل طور پر آزاد ضروری عصری اور بڑی حد تک دینی تعلیم کا انتظام ہو، مادیت پرستی کے اثرات سے آزاد اس نظام کا تسلسل اسلامی معاشرے کی بنیادی ضرورت تھی، جس کی تکمیل وقت کا تقاضا تھا۔

مدارس اسلامیت کی روح کے بقاء کے لیے

اہل مدارس اسلامی آئین و قانون کے مکمل نفاذ کے بغیر کسی طرح پورے معاشرے کو مغربی فکر و فلسفہ سے آلودہ نظام میں جھونکنے کے لیے تیار نہیں تھے، انہوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنے خاص تربیتی نہج پر جس طرح انگریزی سامراج کے دور میں قربانیاں دے کر محفوظ رکھا تھا، وہ اسے ''غیر معیاری'' ترتیب پر ڈالنے اور نامناسب حالات کے سپرد کرنے کے لیے کسی طرح راضی نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا حکومتی تساہل نے نہ تو لارڈ میکالے کے نظام کا تسلسل توڑا اور نہ ہی ہمارا تعلیمی نظام ''اسلامی'' ہو سکا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اِس وقت ملک میں دینی تعلیمی نظام کے جتنے قابل ذکر مدارس قائم ہیں اُن میں سے کوئی بھی مدرسہ قیام پاکستان کے وقت یہاں نہ تھا، بلکہ یہ سارے ادارے اسلامی نظام کا خواب پورا نہ ہونے کی وجہ سے محض معاشرے میں اسلامیت کی روح باقی رکھنے کے لیے ضرورت کے تحت نجی سطح پر وجود میں آئے اور یہ ''نجی سطح'' اس وقت تک قائم رہے گی جب تک یہ ضرورت باقی رہے۔

دہشت گردی کو مدارس سے نتھی کرنا ناانصافی

ایک شبہ ہمارے اہل دانش احباب بار بار کرتے ہیں کہ مدارس کی اہمیت اور انفرادیت تو مسلم ہے لیکن اس نظام سے ''انتہاء پسندی'' اور ''قدامت پسندی'' کا رجحان بڑھا ہے، نیز مدارس میں ''جدید'' سے استفادہ کی حوصلہ شکنی اور اپنے ہاں ''جدید'' کو رواج دینے پر کڑی تنقید کی جاتی ہے، حالانکہ عصری ضرورت کے تحت اس میں کم از کم تسامح تو برتنا چاہئے۔

جہاں تک انتہاپسندی کا طعنہ ہے یہ سابقہ ڈکٹیٹر مشرف صاحب کے دور میں ہونے والی مادر پدر آزاد روشن خیالی کی تردید کے نتیجے میں اہل مدارس کو ملنا شروع ہوا، مدارس کے قیام کا ایک مقصد معاشرہ میں اسلامی اقدار و روایات کی حفاظت تھی، اب اگر وطن خداداد کے معاشرے کو اغیار کے اشاروں پر ننگ دھڑنگ ماحول مخلوط دوڑوں اور فحاشی و عریانی کی طرف دھکیلا جائے گا، تو اس پر احتجاج اور کڑی تنقید مدارس کا آئینی اور قانونی حق ہے، جسے بہرصورت تسلیم کرنا پڑے گا، لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ بعض حضرات اسی تناظر میں وطن عزیز میں برپا خونچکاں بدامنی کو بھی مدارس سے جوڑتے ہیں، جو کہ حقائق کو مسخ کرنے کی بدترین کوشش ہے، اہل دانش پہ واضح ہے کہ وفاق المدارس کے اکابر ملک کے نامور، باوقار، پرامن اور سنجیدہ اہل علم ہیں، جو ہر دور میں وطن عزیز کو ان فسادات سے بچانے میں سرگرم عمل رہے ہیں اور قیام امن کے لیے کی جانے والی اُنکی کوششیں کسی سے مخفی نہیں، حقیقت یہ ہے کہ عالمی سطح پر جاری عسکریت پسندی کو اب کسی گروہ اور مکتبِ فکر سے جوڑنا ممکن ہی نہیں، کیونکہ انکی ذہنی ہم آہنگی نے ایک مستقل مکتب فکر کی شکل اختیار کرلی ہے، ان میں زندگی کے تقریباً ہر طبقہ اور فرقہ سے وابستہ لوگ شامل ہیں تو انہیں مدارس سے نتھی کرنا کہاں کا انصاف ہے؟

مدارس امن کے قلعے

۱۵ مئی ۲۰۰۵ء کو کنونشن سنٹر اسلام آباد میں خطاب کرتے ہوئے سابق وزیراعظم جناب چودھری شجاعت حسین نے سٹیج پر موجود آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جب میں وزیر داخلہ تھا تو میں نے ان لوگوں سے بیس ہزار مدارس کا سروے کروایا، خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے معلومات حاصل کیں، مگر ان بیس ہزار مدارس سے نہ تو کوئی ایک پسٹل تک برآمد ہوا اور نہ ہی کوئی ایسی رپورٹ ملی کہ کوئی مدرسہ کسی قسم کی تخریب یا دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہو، میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ مدارس کے خلاف چلائی جانے والی مہم محض تعصب کی بنیاد پر ہے، میرے خیال میں ناقدین کے ہاں یہ رپورٹ ہماری گزارشات سے زیادہ قابل اعتناء ہوگا، اسی لیے وہ اسی پر غور کرلیں۔

عصری علوم سے استفادہ اور مدارس

قدامت پسندی اور جدید سے استفادے کی حوصلہ شکنی کی بات غالباً اس تناظر میں کی جاتی ہے کہ اہل مدارس، درس نظامی کے ساتھ مروجہ عصری مضامین کو داخل نصاب کرنے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ یہ بات درست نہیں، کیونکہ ہمارے یہاں مروجہ عصری فنون سے استفادہ کا اپنا طریقہ کار ہے، بنیادی عصری مضامین (ریاضی، سائنس، انگلش) ہمارے ابتدائی نصاب کا حصہ ہیں، جن سے ہماری بنیادی ضرورت پوری ہوجاتی ہے، معاشرے میں دینی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے مخصوص عصری نصاب مثلاً صحافت، کمپیوٹر،

اسلامی بنکنگ، معاشیات وغیرہ کے مختلف دینی اداروں میں تخصصات ہیں، جن سے حسبِ ضرورت مخصوص افراد استفادہ کرتے ہیں، کیونکہ یہ تمام عصری فنون بنیادی مقاصد کی تکمیل کا حصہ نہیں، بلکہ معاون کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ان کو باقاعدہ نصاب کا حصہ بنا کر ہر مدرسہ میں رائج کرنا مدارس کی ترجیحات کا حصہ نہیں، جن عصری اور دعوتی فنون کی ایک عالم دین کو مستقل ضرورت ہوسکتی ہے، وہ ہمارے نصاب کا حصہ ہیں جیسے ہیئت، فلکیات، ریاضی، تاریخ اور مطالعہ مذاہب وغیرہ۔

جدید محاورہ اور اسلوب سے واقفیت کی ضرورت

جہاں تک ''جدید'' سے استفادہ کا سوال ہے، اس میں ایک تو جدید محاورہ اور اسلوب کی بات ہے، مجھے اس سے اتفاق ہے کہ اہل علم کو عصر حاضر کے محاورہ سے واقفیت حاصل کرنی چاہئے، کیونکہ ہمارے درسیات اور قدیم علمی ذخیرے کی زبان اور محاورہ عصر حاضر کے لیے نامانوس اور اجنبی ہے اور معاشرہ میں مغربی اقدار کے غلبے نے ہمیں مجبور کر دیا ہے، کہ قرآن وسنت کے ٹھوس علوم کو عصر حاضر کے محاورہ میں لوگوں تک پہنچائیں، اس سے واقفیت داعیان دین کے لیے لازمی ہے، اس سلسلے میں مختلف دینی مدارس ''تخصص فی الدعوۃ'' کرواتے ہیں جس میں اس کمی کے تدارک کا سامان کیا جاتا ہے۔

خذماصفاودع ماکدر حقیقت کیا ہے؟

دوسری بات جدید ذرائع ابلاغ سے دینی دعوت میں استفادہ سے متعلق ہے اگر کبیدگی نہ ہو تو کہنے کی جرأت کروں گا کہ اس سے اس حد تک اتفاق ہمارے لیے ناممکن ہے کہ ٹی وی چینلز تک بات پہنچ جائے، اس سلسلے میں ہمارے بعض اہل علم احباب بھی کہہ دیتے ہیں کہ خذماصفاودع ماکدر پر عمل کر کے ہمیں مثبت پہلو لے کر منفی پہلو چھوڑ دینے چاہئیں، ظاہر ہے کہ اس وقت تمام جدید ذرائع ابلاغ مغربی ثقافت سے ملوث ہیں، اس پر میں ڈاکٹر محمود غازی مرحوم کا ایک واقعہ پیش کروں گا، موصوف فرماتے ہیں: ۱۹۹۲ء میں جرمنی میں منعقدہ ایک اجتماع میں میں نے اس رویہ کو پیش کیا کہ ہمارے ہاں بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو ہمیں اپنے اندر آنے کا موقع دینا چاہئے اور اس کے منفی اثرات کا راستہ روکنا چاہئے یعنی سائنس، ٹیکنالوجی اور ان کی سہولتیں (ذرائع ابلاغ وغیرہ) مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہونے چاہئیں اور ان کو اپنانا چاہئے، جبکہ اخلاقی اقدار کے متعلق ان کے خیالات ونظریات یا سیکولرازم اور لادینیت یا مرد وزن کی آزادی کا تصور دنیائے اسلام کو قبول نہیں کرنا چاہئے اور دنیائے اسلام کی ایک بڑی تعداد اس رویے پر قائم ہیں، اس پر اس اجتماع کے شرکاء جن میں فرانس، جرمن اور آسٹریلیا وغیرہ کے نمائندے شامل تھے تقریباً بالاتفاق مجھے کہنے لگے: ''مغرب ان شرائط کے ساتھ آپ کو اپنی تہذیب سے استفادہ کی اجازت دینے کو تیار نہیں، یہ ایک پورا پیکیج ہے جس کو جوں کا توں قبول کرنا پڑے گا'' (۱۱)

مغرب کی پالیسی

مغرب کی یہ پالیسی ہے کہ اس کی سہولیات سے استفادہ کرنے والا مغرب کے رنگ میں رنگے بغیر نہ رہے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں منفی اثرات محض اتفاق یا مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے پھیل رہے ہیں، یقیناً مسلمانوں میں بھی کمزوریاں ہیں

اوران کی دینی حمیت میں کمی آئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ بالا دست قوتیں بھی ہیں جو طے شدہ پروگرام کے تحت آگے بڑھ رہی ہیں، اور دنیائے اسلام کو ایک خاص رُخ پر چلانا چاہتی ہیں (۱۲) لہذ ابڑی معذرت کے ساتھ کہ ہم نے ''جدید'' کو اس درجہ غالب نہیں ہونے دینا کہ وہ اپنے اثرات بد سے ہمیں ہی شکار کر لے اور ہم اپنا تشخص اور وقار کھو بیٹھیں، اہل انصاف خود مشاہدہ کریں کہ موجودہ دور میں الیکٹرانک میڈیا کی تطہیر خالص اسلامی مزاج کے لیے ممکن ہے؟ جب ممکن نہیں اور یقیناً ممکن نہیں تو اس سے دور رہنے میں ہی عافیت ہے، ہمارے بعض اہل علم بھی یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جو لوگ الیکٹرانک میڈیا کے گرداب کا شکار ہو چلے ہیں اور اس پر نشر ہونے والے الحادی رجحانات سے متاثر ہو رہے ہیں تو ان کی دینی رہنمائی اور ایمان کی حفاظت کے لئے اگر اسے ناگزیر ضرورت کے طور پر لے لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس عذر سے بھی اتفاق مشکل ہے کیونکہ اس میں اب تک محفوظ رہنے والوں کے ملوث ہونے کا خطرہ دوچند ہے لہٰذا ٹی وی چینلز کھول کے جدت پسندوں کی اصلاح تو کیا ہوگی! اچھے خاصے دین داروں کے گھروں میں ٹی وی گھس جائے گا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

ہماری طرف سے ''جدید'' کو مدارس کے ماحول میں رواج دینے پر کڑی تنقید بھی اسی تناظر میں ہے کہ اس سے مغربیت کے تباہ کن اثرات ہمارے معاشرہ کے رہی سہی ساخت کو تباہ کرنے اور دیمک کی طرح چاٹنے کا کام دیں گے، جیسا کہ ظاہر ہے جب کہ ہم مدارس کی قیمتی اور محدود سی پود میں اس حد تک مسامحت پیدا کرنے کے روادار نہیں کہ ان کے دلوں میں اس چیز کو قابل قبول مقام دینے کا شائبہ بھی پیدا ہو، اگر فرض کر لیا جائے کہ ''جدید'' کو رواج دینے سے مغربیت کے اثرات در آنے کا کوئی خطرہ نہیں تو تب بھی جدید علوم وفنون کو مکمل طور پر اور ناقدین کی ترجیحات کے مطابق مدارس میں داخل کر کے ہمیں اس کا اندازہ ہے کہ ہم دینی ورثہ کی حفاظت کے بھی نہ رہیں گے اور جدید سے استفادہ بھی پوری طرح نہ کر سکیں گے بلکہ دونوں نظام ناکام ہوں گے، یا بالآخر انگریزیت کا غلبہ ہو کر دینی تعلیم محض رسم بن جائے گی، کیونکہ جس زبان کا ثقافتی غلبہ ہو اس کے اثرات بالآخر غالب ہو کر رہتے ہیں اور یہ محض مفروضہ نہیں بلکہ خود حکومت پاکستان کی جانب سے اس کے تجربے ہو چکے ہیں، جامعہ عباسیہ بہاولپور میں دینی ودنیاوی نصاب تعلیم کا اکٹھا اور پھر اس کی ناکامی ہمارے سامنے ہے۔

مدارس پر حکومتی کنٹرول

آج کل بعض حلقوں کی طرف سے مدارس کا حکومتی اداروں کے ساتھ جزوی الحاق اور استفادے کا رواج بھی چل پڑا ہے اور اس کی کافی حوصلہ افزائی کو جا رہی ہے، مدارس کا ریاستی تعلیمی اداروں سے الحاق یا بالکلیہ حکومتی کنٹرول میں جانا ان کے اہداف کے لیے سخت نقصان دہ ہے اور اس کی کسی طرح حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی، اسی حوالے سے مولانا زاہد الراشدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''دینی مدراس واداروں پر ریاستی کنٹرول کے بارے میں کچھ عملی تجربات بھی حکومتی عزائم کے راستے میں رکاوٹ ہیں اور ان تجربات کے بعد دینی تعلیم کے حوالے سے حکومتی نظام پر کسی درجے کا اعتماد قائم ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا، مثلاً صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں محکمہ اوقاف قائم ہوا تھا جس نے ملک بھر میں ہزاروں مساجد، مزارات اور ان کے ساتھ بیسیوں مدارس کو تحویل میں لے لیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ان کا نظام صحیح نہیں ہے اور انکی مالیات میں گڑبڑ ہوتی

ہے، اس لیے انہیں سرکاری تحویل میں لیا گیا ہے تا کہ ان کے نظام کو بہتر طریقے سے چلایا جائے لیکن عملاً یہ ہوا کہ نظام پہلے سے بھی خراب ہو گیا جس کا مشاہدہ محکمہ اوقاف کے زیر انتظام مساجد اور عام مسلمانوں کی آزادانہ کمیٹیوں کے تحت قائم مساجد کے نظاموں کا کسی بھی شعبے سے تقابل کیا جا سکتا ہے، اوقاف کی تحویل میں جانے کے بعد مدارس کی کارکردگی کی ایک واضح مثال اوکاڑہ کے گول چوک کی جامع مسجد میں قائم جامعہ عثمانیہ کی شکل میں موجود ہے، محکمہ اوقاف کی تحویل میں جانے سے قبل یہ مدرسہ ملک کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا اور اس میں سینکڑوں طلبہ ہاسٹل میں رہتے تھے مگر اب وہاں کوئی درس گاہ نہیں جب کہ مدرسے کے کمرے محکمہ اوقاف نے مختلف لوگوں کو کرائے پر دے رکھے ہیں، صدر ایوب ہی کے دور میں ریاست بہاولپور باقاعدہ طور پر پاکستان میں ضم ہوئی تو وہاں کا سب سے بڑا دینی مدرسہ جامعہ عباسیہ تھا، جسے حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا، اسے اسلامی یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا، دینی نصاب تعلیم اور سرکاری نصاب کو ملا کر ایک مشترکہ نصاب تعلیم مرتب کیا گیا، علامہ شمس الحق افغانیؒ، مولانا سعید احمد کاظمیؒ اور مولانا عبدالرشید نعمانیؒ جیسے بہت سے علمائے کرام کو مختلف حصوں سے لا کر بہاولپور میں بٹھایا گیا اور ایک ''ماڈل دارالعلوم'' یا ''ماڈل اسلامی یونیورسٹی'' کا اعلان کیا گیا لیکن آج اس کی حالت یہ ہے کہ دینی نصاب تعلیم کے مضامین اس کے نصاب سے بتدریج خارج ہو چکے ہیں اور اس کا نصاب اب وہی ہے جو ملک کے دیگر سرکاری یونیورسٹیوں کا ہے، ان واقعات سے دینی حلقوں کا یہ ذہن مزید پختہ ہو گیا ہے کہ دینی مدارس پر ریاستی کنٹرول یا دخل اندازی سے حکمرانوں کا مقصد یہ ہے کہ یہ مدارس یا تو جامعہ عثمانیہ اوکاڑہ کی طرح یا تو بالکل ختم ہو جائیں اور اگر ختم نہیں ہوتے تو جامعہ بہاولپور کی طرح سرکاری نظام تعلیم میں ضم ہو کر اسی کا حصہ بن جائیں، اسی وجہ سے بھی دینی مدارس اور ان سے وابستہ دین دار عوامی حلقے مدارس پر ریاستی کنٹرول یا سرکاری محکموں سے کسی درجہ کے تعلق کا ''رسک'' لینے کے لیے تیار نہیں'' (۱۳)

ہمیں کیا اور معاشرے کی دینی ضروریات کیسے پورا کرنا ہے؟

آخر میں بصد احترام اہل دانش ناقدین کی خدمت میں چند گزارشات پیش کروں گا، ہمارے ہاں عموماً مدارس کے نظام تعلیم پر نقد کے وقت ماضی کی اسلامی خلافتوں میں قائم اداروں کا حوالہ دیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے صرف نظر کر لی جاتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی معاشرتی ساخت، تہذیب وتمدن اور اوضاع اطوار اغیار کے دست برد سے پوری طرح محفوظ تھے، ہمارے پیش نظر یہاں کا موجودہ معاشرہ ہے، جس میں اسلامیت کی بیخ کنی اور مسلمانوں کو محض نسلی وقومی مسلمان رکھنے کے لیے مغرب کی طرف سے پوری تندی کے ساتھ کوشش جاری ہے اور ہمارا موجودہ سسٹم ان کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ بلکہ معاون کا کردار ادا کر رہا ہے، اس لیے ہم اس حوالے سے کافی حساس ہیں کہ ہمارے ہاں آنے والے لوگ اگر خالص بھوس اور قدیم تعلیمی نظام سے ذرا بھی ادھر ادھر ہٹیں گے تو عام معاشرتی اور ثقافتی فضاء میں ان کا اپنے اہداف سے بھٹکنے اور تشخص وامتیاز کو کھونے کے مواقع کسی طرح کم نہیں، اس لیے اس بات کو تو بحث ہی سے خارج کر دینا چاہئے کہ موجودہ سسٹم کی موجودگی میں اہل مدارس قدیم نصاب تعلیم سے دستبردار ہو جائیں گے یا جدید کے ساتھ الحاقی مشورہ کو قبول کر لیں گے۔

مدارس میں سے اصلاح وترمیم کی کوششوں کو اہل علم پر اعتماد کرتے ہوئے انہی پر چھوڑ دینا چاہئے، ڈیڑھ صدی سے زیادہ

عرصہ میں مدارس نے بہت کچھ پایا ہے اور اس وسیع تجربے کے تناظر میں انہیں اندازہ ہے کہ استعماری طاقتوں کے غلبے اور تہذیبِ مغرب کی سیاسی بالاتری میں ہمیں کیا کرنا ہے اور معاشرہ کی دینی ضروریات کو کیسے پورا کرنا ہے۔

مغربی تہذیب جذب کرنے والے ادارے اور ان کے پروردہ

ہاں! ضروری پہلو یہ ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرہ میں سینکڑوں ایسے سکولز اور کالجز نچی سطح پر قائم ہو گئے ہیں جہاں مادیت پرستی کے زہریلے اثرات پوری آب وتاب پر ہیں، مرد وزن کا اختلاط اور اسکے سنگین نتائج کا مشاہدہ روز ہو رہا ہے، نصاب تعلیم پوری طرح اسلامی قدروں سے آزاد ہے، طلبہ کو ابتدائی دینی معلومات اور اردو زبان وادب سے کوئی شناسائی نہیں، وہ قالب کے لحاظ پاکستانی اور قلب وذہن کے اعتبار سے سو فیصد مغربی ہیں اور انکے عقائد وخیالات اعمال وافعال اور وضع وقطع میں اسلام کی کوئی چھاپ نہیں، یہ ادارے بڑی خاموشی سے ایک نئی نسل معاشرہ میں سپلائی کر رہے ہیں، یہی لوگ سرکاری مشنری کا حصہ بنتے ہیں اور ملکی سیادت وقیادت اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، ایسے اداروں کے فیض یافتہ کئی طلبہ میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکے کہ آپ کا نصاب تعلیم آپکو کیا جواب مہیا کرتا ہے کہ آپ ایک مسلمان ہیں اور اسلام کے آپ سے کیا تقاضے ہیں؟ پاکستان جس نظریے کے تحت حاصل کیا گیا اُس کے مطابق معاشرے کی تشکیل کیسے ممکن ہے؟ الغرض ان اداروں سے نکلنے والے مغربی فکر وفلسفہ کو پوری طرح جذب کر کے نکلتے ہیں اور سیکولرازم کو بطور نظریہ حیات قبول کر چکے ہوتے ہیں۔

دانشورانِ ملت کی ذمہ داریاں

دانشورانِ ملت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے تعلیمی اداروں کا قبلہ درست کرنے کے لیے اقدام کریں، حکومتی سطح پر ان کے لیے ایسا متفقہ نصاب اور نظام تشکیل دینے کی اور ان کو اس کا پابند بنانے کی جدوجہد کی جائے جس میں طبقاتی اور الحادی رویوں کا سدباب ہو، اگر ہمارے دانشور ایسا کرنے کے لیے قدم اٹھائیں گے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا، دوسرے مرحلہ پر سرکاری نظام ونصاب تعلیم کا جائزہ لے کر اسکی ان خطوط پر تشکیل کرنے کی فکر کی جائے جن پر پاکستان کو حاصل کیا گیا تھا یعنی ''اسلامی نظریہ حیات سے مکمل ہم آہنگی'' سرکاری اداروں میں اسلامیات کی محض غیر مؤثر پیوندکاری ختم کر کے اس کی اساسی حیثیت بحال کرنے کی فکر کی جائے۔

منظم اور جامع نصاب

ایک اہم کام اور بھی ہوسکتا ہے کہ اہل دانش حضرات از خود ایک منظم نظام اور جامع نصاب اردو زبان میں ترتیب دیں، جو مغربی فکر وفلسفہ سے پاک ہو، اس میں تعمیرِ اخلاق وشخصیت کے لیے اسلامی فلسفہ حیات کو پیش نظر رکھیں اور دینیات کا ضروری اور مؤثر حصہ شامل کر کے اسکے عملی نفاذ کو لازمی قرار دیں اور اپنے پڑھنے والوں کو قلب وقالب کے اعتبار سے پکا مسلمان رکھیں، پھر اس کے لیے سکول کی سطح سے نچی ادارے قائم کریں اور تدریجاً سفر جاری رکھتے ہوئے کالجز اور یونیورسٹیز تک جائیں اور عالی فنون (میڈیکل، انجینئرنگ اور سائنس وٹیکنالوجی) کے مروجہ نصابوں کی تطہیر وتجرید اور تہذیب وتنقیح کر کے آگے بڑھیں، ان شاء اللہ اس سے وہ معاشرے کو مفید اور کامل مسلمان کی شکل میں قیمتی اثاثہ مہیا کرنے والے بنیں گے، ظاہر ہے یہ عزم وہمت کا متقاضی کام ہے، اس کے لیے ثانوی

درجہ (مڈل اور ہائی سطح) تک اہل مدارس کی طرف سے بھی کوششیں ہوئی ہیں، اقراء روضۃ الاطفال اور بیت العلم کراچی کا نصاب اس حوالے قابل استفادہ ہیں، اگر ہمارے دانشور اہل مدارس کی اس کاوش کو سامنے رکھ کر مزید کام کریں تو مؤثر اور بہترین نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

ریاستی نظام اپنا قبلہ درست کرلے

مذکورہ اداروں کی اسی روش پر برقرار رہتے ہوئے دینی مدارس کا ایسے نظام تعلیم سے اشتراک، الحاق یا استفادہ کسی طرح ممکن نہیں، ہاں! اگر ریاستی نظام میں اصلاحات کا خواب پورا ہوتا ہے تو پھر مولانا زاہد الراشدی صاحب کی یہ بات بالکل درست ہے کہ ''اگر ریاستی نظام اپنا قبلہ درست کرلے'' جو ہمارے ہاں ایک نظریاتی اور خالص اسلامی ریاست وحکومت قائم ہونے کے بعد ہی ممکن ہے، تو ایک خالص اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کرنے سے دینی مدارس کو قطعی طور پر انکار نہیں ہوسکتا، لیکن سیکولر اہداف رکھنے والے ریاستی نظام کی عملداری یا دخل اندازی کو قبول کرنا دینی مدارس کے لیے اپنے بنیادی مشن اور ہدف سے محروم ہوجانا ہوگا، اس لیے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا (۱۴)

دانشواران ملت کی مذکورہ اداروں میں اصلاح وترمیم سے چشم پوشی اور مدارس پر اس کے لیے اصرار اور دباؤ اہل مدارس کو ان دگرگوں حالات میں تشویش کا شکار کردیتا ہے کہ کہیں ہمارے مخلصین کی آواز کے پیچھے مغربی ایجنڈے کا ڈورا تو نہیں ہل رہا، جس سے نادانستہ متاثر ہوکر یہ سب کچھ کہا جارہا ہو کیونکہ یہ بات ان کے ہاں بھی مسلم ہے کہ اصلاح وترمیم کے زیادہ محتاج مذکورہ عصری ادارے ہیں اور انکا نظام معیاری نہیں، لہٰذا ہم کیسے اس نظام سے اشتراک یا الحاق کی طرف مائل ہوسکتے ہیں۔

میری ان گزارشات کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ اہل مدارس کو مطلقاً اصلاح وترمیم کی ضرورت نہیں، ہم اصلاح وترمیم کے نہ صرف داعی بلکہ عامل ہیں لیکن وہ اصلاح وترمیم جو ہماری ترجیحات کے مطابق ہو اور ہمیں اپنے مخصوص اہداف ومقاصد میں مدد دے، ظاہر ہے کہ یہ سب اس نظام کے اندرونی ماہرین کی آراء اور کوششوں سے ہوگا اور اب تک ہوتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص سے ملک وملت کی مقبول خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔

مصادر ومراجع

(۱) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، از مولانا مناظر احسن گیلانی (۲) انیسویں صدی کے تعلیمی تناظر میں: ہندو مسلم رویے، مختار احمد گوندل، ماہنامہ حکمتِ بالغہ دسمبر ۲۰۱۴ء (۳) حوالہ بالا (۴) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تہذیب الاخلاق، ص:1 از سرسید احمد خان (۵) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تاریخ دارالعلوم دیوبند از محبوب رضوی، علمائے ہند کا شاندار ماضی از مولانا محمد میاں (۶) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: نقشِ حیات از مولانا حسین احمد مدنی، تاریخ ریشمی رومال از مولانا محمد میاں (۷) دینی مدارس اور عصر حاضر، ص:۹۳ (۸) شبیر احمد خان میواتی (۸) پاکستان میں نفاذ اسلام از ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی، ماہنامہ حکمت بالغہ دسمبر ۲۰۱۴ء (۹) حوالہ بالا (۱۰) پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ، ص:۱۹ (۱۱) ہمارا تعلیمی نظام، ص:۸۷ از مفتی محمد تقی عثمانی (۱۲) دینی مدارس اور عصر حاضر، ص:۱۴۱ از شبیر احمد خان میواتی (۱۳) دینی مدارس اور عصر حاضر، ص ۱۴۳ از شبیر احمد خان میواتی (۱۴) دینی مدارس کا نصاب ونظام نقد ونظر کے آئینی میں، ص:۶۱، ۶۲، ۹۵ (۱۵) حوالا بالا

پروفیسر محمد انس حسان
گورنمنٹ ڈگری کالج جہانیاں

زمانہ جاہلیت کی شاعری کا عمومی جائزہ

عربی لغت اور زبان اپنی ماہیئت اور تنوع کے اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر حیثیت کی حامل ہے، صرف یہی نہیں کہ اس میں مترادفات بکثرت پائے جاتے ہیں بلکہ مظاہر قدرت کے ہر ایک شعبے کے لیے (خواہ وہ کیسا ہی ناقابل التفات کیوں نہ ہو) ایک مخصوص لفظ موضوع ہے، یہی امر اس کے کمال اور نقص ہر دو کا باعث خیال کیا جا سکتا ہے، یہ زبان جزئیات کے مفہوم کے ادا کرنے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان ایک ہی لفظ کے اس کی کیفیت کے اعتبار سے مختلف معانی کے ادا کرنے میں پورے طور پر قادر ہے اور یہ خصوصیات کم وبیش ہر ایسی قوم کی زبان میں پائے جاتے ہیں جن کی تمدنی حالت صحرائے عرب کے باشندوں کی تمدنی حالت سے ملتی جلتی ہے، مگر عربی زبان بلحاظ اس امر کے کہ اس کی نہایت وسیع لغت نے ایک بڑے عظیم الشان تمدن کے پھیلانے میں ایک بڑا بھاری حصہ لیا ہے، ممتاز ہے۔

زمانہ جاہلیت سے مراد

اصطلاح مؤرخین میں زمانۂ جاہلیت سے نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے کا زمانہ مراد لیا جاتا ہے مگر ہم اسے ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں، یعنی زمانۂ جاہلیت سے مراد بعثت سے تخمیناً سوا سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔

اصحاب لغت کے یہاں جہل کے معنی اکھڑ پن کے ہیں جس کی ضد علم نہیں بلکہ حلم ہے، حلم سے مراد ایک مہذب انسان کا اپنی تمام اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ اس کی تائید میں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں، عمرو بن کلثوم کہتا ہے

الا لا یجھلن أحَدٌ علینا فنجھل فوق جھل الجاھلینا

خبردار ہمارے سے کوئی اکھڑ پن سے نہ پیش آئے ورنہ ہم سب سے بڑھ کر اکھڑ پن دکھلائیں گے۔

عبید بن ابرص اپنی قوم کی مدح میں کہتا ہے

بیض بھا لیل تنفی الجھل حلمھم و تفزع الارض منھم اذھم سخطوا

(میری قوم کے لوگ) چمکتے ہوئے چہروں والے سردار ہیں جن کا تحمل مخالفوں کے اکھڑ پن کو ناکارہ کر دیتا ہے، مگر جب وہ خود غصہ میں آتے ہیں تو کرۂ زمین مارے خوف کے تھر تھرا اٹھتا ہے۔

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے

وتجھل ایدینا و تحلم رأینا و نشلم باالافعال لابالتکلم

ہمارے ہاتھ تو اکھڑ پن کرتے ہیں۔ لیکن ہماری رائیں باوقار ہیں۔ ہم زبان سے نہیں بلکہ ہاتھوں سے گالیاں دیتے ہیں۔

عربی کے منظوم لٹریچر

پانچویں صدی عیسوی کے اوائل میں تمام شمالی عرب کی زبان متحد ہو چکی تھی، مگر اس کا تمام لٹریچر منظومات تک ہی محدود تھا کیونکہ جاہلیت میں نوشت خواند کا رواج بہت کم تھا۔ بلاذری نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں ان معدودے چند اشخاص کے نام قلم بند کیے ہیں جو خوش قسمتی سے لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور وہ بھی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے یہ ملکہ غیر مکمل طور پر شام اور عراق کے درباروں کے ذریعے حاصل کیا۔ لیکن چونکہ نظم ونثر کی نسبت بسہولت زبانی یاد رہ سکتی ہے، اس لئے روایاتِ ادب میں نظم کو نثر پر قدرتاً ترجیح رہی۔

عربی کے نثری لٹریچر

نثر جو ہم تک پہنچی ہے وہ تمام تر قس بن ساعدہ، معبد ابن طوق العنبری جیسے اشخاص کی لمبی لمبی تقاریر کے ٹکڑے یا ضرب الامثال یا اکثم بن صیفی جیسے حکماء کے دانش مندانہ اقوال ہیں جو اوائل عصر عباسی کے محققین مثلاً ابو عبید مفضل غبی جیسے لوگوں کی اَن تھک کوششوں کے طفیل ہمارے لئے العقد الفرید، امثال العرب، صبح الاعشیٰ اور کتاب الاغانی جیسی تصانیف میں محفوظ ہیں، اسی طرح نظم میں امراؤالقیس، زہیر بن سلمی، عمرو بن کلثوم اور عنترۃ بن شداد، طرفۃ بن عبد، حارث بن حلزۃ وغیرہ کا کلام ہم تک پہنچا ہے، بعض شعراء ایسے بھی ہیں جنہوں نے دونوں زمانے (جاہلیت واسلام) پائے، انہیں محضرمین کہا جاتا ہے، مثلاً حسان بن ثابت، کعب بن زہیر، ابومحجن، متمم بن نویرۃ، لبید بن ربیعۃ اور خنساء وغیرہ، جبکہ معلقات، حماسہ، الکامل للمبرد، نہایۃ الارب، نقائض جریر وفرزوق اور مجمع الامثال وغیرہ میں نظم جاہلی کا کافی سرمایہ ملتا ہے، سب سے قدیم عرب شاعر جس کا کلام ہمیں دستیاب ہوا ہے، وہ مہلہل بن ربیعۃ ہے، اس کے نوے اشعار متفرق طور پر موجود ہیں۔

شعرائے جاہلیت کا کلام ایک مرجع اور کسوٹی

دنیا کے بہت سے دیگر ادبیات کی طرح عربی ادب بھی پہلے پہل زبانِ نظم سے گویا ہوا۔ نظم عربی (باوجود یہ کہ قواعد عروض و قوافی کی باضابطہ تدوین وترتیب بہت دیر بعد ہوئی) نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ صحیح معنی میں اپنی تمام ضروریات عروضی کو ساتھ لئے ہوئے شمالی عرب کے وسیع علاقے میں معرض وجود میں آ گئی، اوائل قرنِ سادس کے شعراء کا کلام زبان کے نہایت لطیف امتیازات پر اس طرح مشتمل نظر آتا ہے کہ بعد کے آنے والے معجز کلام شعراء بھی اس سے سبقت نہ لے جا سکے۔

قرونِ مابعد کے ناقد ہمیشہ شعرائے جاہلیت کے طرزِ بیان، محاورہ اور اداء کو معیار ٹھہرا کر متاخرین کے کلام کی صحت وغلطی کو پرکھا کرتے تا آنکہ ان کے رجعت پسند خیالات نے یہاں تک ترقی معکوس کی کہ زمانۂ جاہلیت سے قرب وبعد ہی کو طرزِ بیان کی صفائی اور دل نشینی کا معیار قرار دے دیا گیا، جتنا کوئی شاعر جاہلیت سے قریب ہوتا اتنا ہی اسے مدح وستائش کے زیادہ قابل سمجھا جاتا، اگرچہ بعد میں شعوبیہ کی تحریک میں ابو نواس جیسے منچلوں نے اس معیار کو پائے نفرت سے ٹھکرا کر ''طرح نو در اندازیم'' کی صلائے عام دی اور ابن قتیبہ جیسے حق پسند مورخین نے بدلائل اس کا رد کیا مگر یہ خیال ادباء خصوصاً مشارقہ کے دماغوں میں آج تک ایک غیر محسوس طریق پر مرکوز چلا آ رہا ہے۔

اتحادلغت عربی

نظم جاہلی کے مطالعے کے وقت ہم اس امر کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ قبل از اسلام کی نظمیں جو جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں کے مختلف قبائل کے مختلف شعراء کی طرف منسوب ہیں ان کی زبان میں کوئی معتد بہ اختلاف نہیں پایا جاتا، آغاز بعثت سے پہلے جزیرۃ العرب کے ایک وسیع علاقے میں ایک ہی زبان جسے بعد میں تفصیلاً ''لسان عربی مبین'' سے تعبیر کیا گیا، رائج ہوگئی تھی، گو مقامی بولیوں میں کچھ کچھ اختلاف ضرور پایا جاتا ہوگا مگر وہ چنداں قابل التفات نہیں، اس اتحادلغت کے کئی ایک بواعث قرار دیے جا سکتے ہیں، مثلاً صحرانشین قبائل کا گھاس اور پانی کی تلاش میں ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف نقل مکانی کرنا اور حج بیت اللہ کے عظیم الشان سالانہ اجتماع کا منعقد ہونا، ایک بڑی حد تک زبان کے اندر اتحاد پیدا کرنے میں دخل رکھتے ہیں، اسی طرح عکاظ کا میلہ بھی قبائل کی خصومتوں، عداوتوں، خانہ جنگیوں، ملکی فسادات، اختلافات اور جھگڑوں کو عارضی طور پر فرو کر دینے کی وجہ سے مقامی بولیوں کے باہم شیر وشکر ہوجانے میں بڑا مفید ثابت ہوا، علاوہ ازیں غسانی خاندان دمشق اور لخمی خاندان الحیرہ کے پرتکلف اور عیش پسند درباروں کے اثر نے مختلف مروجہ بولیوں کے اتحاد کا راستہ اور بھی صاف کر دیا۔

نظم عربی کا منبع ومبداء

نظم عربی کا منبع نثر مقفی یعنی سجع کو تصور کیا گیا ہے، اپنے دماغ میں ایک بے آب وگیاہ سراسر خشک بنجر اور ریتلے بیابان کے پار کارواں کے لمبے لمبے اسفار کا تصور کیجئے! جبکہ اونٹ کی ناہموار رفتار سوار کے جسم کو پیچ وخم میں ڈال رہی ہوتی ہے تو اشتربان اپنے سفر کے احساس کو طبیعت سے دور کرنے کے لئے ایک سُریلی لَے میں الاپنا شروع کر دیتا ہے، ناگاہ وہ کیا دیکھتا ہے کہ سب اونٹ اپنے سروں کو اٹھائے پہلے کی نسبت زیادہ تیزی سے چلنا شروع کر دیتے ہیں، اونٹ کے بھاری پاؤں کے متوازن طور پر زمین پر پڑنے سے ایک گونہ موزونیت محسوس ہوتی ہے، اسی موزونیت سے موسیقی اور موسیقی سے نظم عربی نے جنم لیا، سو یہ ''حِدا'' یا ''حُدا'' جو ایک خاص قسم کی ضرورت سے پیدا ہوئی عربی نظم کا مبداء بن گئی۔

نظم عربی کا مولد

نظم عربی کا مولد وسطی اور شمالی عرب ہے جس کا کچھ حصہ تو ریگستان تھا گو کہیں کہیں سرسبز خطے بھی پائے جاتے تھے مگر زیادہ تر بے آب وگیاہ چٹیل میدان تھا، جہاں گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی ہوتی تھی، بارش نام کو بھی نہیں ہوتی تھی جس کی وجہ سے کسی قسم کی مستقل رہائش یا قیام کا انتظام بعید از خیال امر نظر آتا تھا، زمانۂ قدیم سے اس علاقے کے باشندے جو طبعی حالات کے رو سے بادیہ نشین تھے، اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے گلے کے گلے لئے پھرتے چلے آتے تھے کیونکہ ان کا سامان معیشت انہی پر منحصر تھا، ضرورت وقتی کے لحاظ سے وہ ہمیشہ سبزہ زار اور چراگا کی تلاش میں اپنے کمبل اور سیاہ ٹاٹ کے خیموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے تھے، جنگل کی تازہ اور صاف ہوا، خوبصورت نیلا آسمان، ایک ہوکا عالم اور افق سے پرے پھیلا ہوا صحرا جہاں نظر کے حائل صرف ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور کہیں کہیں کھجور کے سربفلک درخت، جنہیں صبح وشام کی شفق اپنی قرمزی چادر پہنا دیتی ہے، انسانی

جذبات کے اُبھارنے اور قدرتی تشبیہات واستعارات پیش کرنے میں ایک حیرت افزاء اعجازی اثر دکھلاتے تھے، حیاتِ انسانی کا دامن تمدن ومعاشرت کے بدنما دھبوں سے آلودہ نہیں ہونے پایا تھا، قطامی کے اشعار سے ذیل کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے

ومن تکن الحضارة اعجبتۂ فایّ رجالٍ بادیة ترانا

ومن ربط الجحاش فان فینا قنا سلبا و افراساً حسَانا

جنہیں شہری زندگی اچھی لگے تو لگے، ذرا ہم بادیہ نشینوں کو بھی دیکھ کہ کیسے زندگی بسر کرتے ہیں، جو شخص اپنی امارت کے اظہار میں گھر کے سامنے گدھے باندھے تو باندھے، ہمارے یہاں تو لمبے مضبوط نیزے اور خوبصورت گھوڑے ہیں۔

دلکش طبعی وفطری ماحول کالٹریچر

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو قوم ایسے دلکش طبعی مظاہر کے ماحول میں زندگی بسر کرتی ہو اس کا لٹریچر بھلا کن کن انسانی جذبات و عواطف کو اپنے اندر نہ لئے ہوگا، عرب بادیہ نشینوں کی غیر متبدل زندگی صرف شدت قحط کے دنوں میں جب کہ موسم سرما کی خون کو منجمد کر دینے والی بادنکباء ان کے خیموں کے گردو پیش کے دمن ومزابل کو تہہ وبالا کرتی تھی بدل سکتی تھی، ورنہ ان کی اپنی نوعیت کی زندگی نے ان کے اوضاع واطوار کو ایک مخصوص غیر متحرک سانچے میں ڈھال رکھا تھا اور یہی امر ان کے طبعی جذبات کو ہر ایک بیرونی عارضی اثر سے محفوظ رکھنے کا بڑا باعث تھا۔

نظم جاہلیت کی دل نشینی ودلکشی

نظم جاہلیت کی دل نشینی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے طبقوں کے بڑے بڑے مقتدر لوگ شعرائے جاہلیت کا کلام سن کر اور پڑھ کر سر دھنا کرتے، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ جیسا عظیم الشان شخص صحرائی بدویوں کے شعر سن کر لطف اندوز ہوتا، زھیر ابن ابی سلمیٰ کے اشعار کی بابت آپ کی رائے مشہور ہے، جن لوگوں نے عہد خلافت کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی آگاہ ہیں کہ مالک بن نویرہ کے جنگ ارتداد میں قتل پر اس کے بھائی متمم کی نظمیں خالدؓ بن ولید جیسے جلیل القدر شخص کے عزل کا باعث قرار پائیں، حضرت ابن عباسؓ جن کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فَقِّهه فِی الدِّین کی دعا فرمائی اور جنہیں علم تفسیر کا ابوالبشر کہنا بجا ہے، شعر وسخن کے بڑے دلدادہ تھے، عبد اللہ بن ابی ربیعة المخزوی اور آپ کی حکایات اہل ادب کے یہاں معروف ہیں، ابن عباسؓ تو بسا اوقات محاورۂ قرآن کی تصدیق میں کسی جاہلی شاعر کے شعر سے استشہاد بھی فرمایا کرتے اور اسے تفسیر قرآن کے لیے ضروری خیال فرماتے تھے، غالباً یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے (جو جاہلیت کے تمام دیگر اطوار وعادات سے بیزار تھے) جاہلی نظم کی پوری طرح حفاظت کی، حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شعرائے جاہلیت کے حکمت ودانش کا کلام سن کر نہایت محظوظ ہوتے تھے، چنانچہ لبید بن ربیعہ کے شعر

الا کل شی ما خلا اللّٰہ باطل وکل نعیم لا محالة زائل

سنو! اس وحدہ لاشریک کے سوا ہر ایک چیز فانی ہے اور ہر ایک خوشی کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو کر رہے گا،

سن کر فرمایا کہ عرب کے کلام میں اس سے زیادہ کوئی سچا کلام نہیں، حسانؓ ابن ثابت سے (منبر پر چڑھوا کر) قریش کے

متعلق منظوم کلام سنا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کی زبانی مروی ہے کہ

ارفع ضعیفک لا یجیزک ضعفہٗ یوماً فتدرکہٗ العواقب قد نما

یجزیک او یثنی علیک و ان من اثنی علیک بما فعلت کمن جزی

کمزور و ناتواں کو اٹھا جو تجھے جزا تو نہیں دے گا پر اس کے بعد کے حالات اسے ضرور معراج کی ترقی پر پہنچا دیں گے، سو اس وقت یا تو تجھے جزا دے گا یا تیری مدح وثنا کا گیت گائے گا، یہ بھی ایک گونہ جزا ہی ہوا کرتی ہے،

بے مقصد شاعری سے اجتناب، با مقصد شاعری کی حوصلہ افزائی

ایسی روایات سے ان متعصب لوگوں کے الزام کی بخوبی تردید ہوتی ہے جن کے مطابق نبی کریم ﷺ اور اسلام نے بالعموم شاعری کو قابل اعتراض قرار دیا ہے، یہ ضرور ہے کہ تدریجاً فحش اور بے مقصد شاعری سے اجتناب کی تلقین کی تاہم شاعری کو مقصدیت اور اسلام کی سربلندی کے لیے استعمال کرنے کو نہ صرف پسند فرمایا بلکہ حوصلہ افزائی بھی فرمائی، بہرکیف یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ادب عربی کا جمع وترتیب

ادبیاتِ عرب کی باضابطہ جمع وترتیب کا زمانہ دولت عباسیہ کے اوائل سے شروع ہوتا ہے، اس سے پہلے یہ ذخیرہ راویوں کی زبانی اور یادداشتوں کی بدولت زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہا، ابتداء میں راوی جو خود بھی شاعر ہوتا کسی شاعر کے تلمذ میں اس کے راوی کی حیثیت سے زندگی کا ایک حصہ بسر کرتا لیکن بعد میں یہ ایک مستقل فن قرار پا گیا، رُواۃ کے غیر معمولی قوت حافظہ کی نسبت بہت سی حیرت انگیز روایات مروی ہیں، مثلاً حماد الراویۃ نے ایک ہی نشست میں ۲۹۰۰ نظمیں سنائیں، تاہم باوجود اس غضب کے قوت حافظہ کے سہو ونسیان کا احتمال بالکل ممکن ہے، کیونکہ عربی نظم کی ہیئت مخصوصہ بعض اشعار کے رہ جانے یا غلط جگہ پر رکھے جانے یا منتحل ہو جانے کو بڑی آسانی سے قبول کرتی ہے اور قرین قیاس ہے کہ بعض راویوں نے اپنے یا کسی دیگر گم نام شاعر کے کلام کو کسی بڑے مشہور شاعر کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی ہو، با ایں ہمہ نظم جاہلیت کا ایک بڑا حصہ جو ہم تک پہنچا ہے وہ یقیناً قابل وثوق ہے اور یہ بھی تاریخی طور پر مسلم ہے کہ جو کچھ ہمارے سامنے موجود ہے وہ تلف شدہ حصے سے اقل قلیل کی نسبت رکھتا ہے تاہم جو کچھ بھی پایا جاتا ہے وہ ایسا ہے جو محققین کی نظروں میں سالہا سال سے ایک قابل قدر ادبی ذخیرہ تصور کیا گیا ہے۔

تین مواقع پر رسم تہنیت

ابن رشیق نے لکھا ہے کہ عرب بادیہ نشین صرف تین مواقع پر آپس میں رسم تہنیت بجالاتے تھے:

☆ بیٹے کی ولادت ☆ قبیلہ سے کسی کے شاعر ہونے پر ☆ شریف النسل گھوڑی کے بچہ دینے پر

ان کے خیال میں شاعر ایک طرح کا جادوگر اور جنوں پریوں سے ہم راز ہونے کے باعث مافوق العادت امور پر قادر ہوتا تھا، اس کی یہاں تک عزت کی جاتی کہ قبیلہ کے لوگ اسے لسان الغیب تصور کرتے، صلح وجنگ کے معاملات میں اس کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیتے، جاہلی ادب میں عربوں کی نفسیات کا غور سے مطالعہ کرنے پر درج ذیل نتائج نکلتے ہیں:

ہجوومذمت

جاہلی عرب کے ادب کا پہلا موضوع ہجوومذمت تھا، بادیہ نشین اعراب کے خیال میں الفاظ قوائے روحانیہ وجسمانیہ ہر دو پر اثر ڈالنے کا ایک مفید اور کارگر آلہ تھے کیونکہ وہ اپنے گردوپیش کی اشیاء کوذی روح فرض کر کے خطاب کیا کرتے تھے، ہجو سے محض اپنی بڑائی اور دوسرے کی برائی ہی مدنظر نہ ہوتی تھی بلکہ اسے ایک خطرناک حربہ سمجھا جاتا تھا جو استہزاء اور استحقار کے ساتھ مخالف کی بدنی طاقت پر بھی موثر ثابت ہوتا اور اس کے اعضائے جسمانی کو بھی ناکارہ اور شل کر دیتا تھا، یہ اَن لکھے الفاظ تیر سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ گردونواح کے قبائل میں پھیل جاتے اور مخالف کی کمال تذلیل وتحقیر کا موجب ہوتے۔

مرثیہ گوئی

دوسری صنف جس نے ان کے یہاں رواج پایا وہ مرثیہ گوئی تھی، مرثیہ گوئی عموماً قبیلے کی خواتین کا حصہ ہوتا تھا، عرب کی مشہور شاعرہ خنساءؓ اس موضوع میں خاص پایہ رکھتی تھیں، جن کے کئی مرثیے ہم تک پہنچے ہیں۔

عشق ومحبت، سوز وگداز، ہجر ووصل

تیسری قسم جو مروج ہوئی، وہ نظمیں ہیں جنہیں ابوتمام نے باب النسیب میں ترتیب دیا ہے، ایسی نظموں میں عموماً عشق ومحبت، سوز وگداز، ہجر ووصل، ناز ونیاز وغیرہ جیسے جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا، اس قسم کے منظومات عربوں جیسے غیرت مند، آزاد اور سلیم الذوق قوم کا طبعی خاصہ ہیں۔

شاعری بحیثیت ایک فن

مگر زمانہ بعثت سے ڈیڑھ سوسال قبل یا یوں کہیے کہ عربی شاعری کی ابتداء کا جب سے ہمیں سراغ ملتا ہے، شاعری بہ حیثیت ایک فن ہونے کے غیر معمولی رسوم اور تکلفات کی زنجیروں میں جکڑی جا چکی تھی جس پر اس دور کے قصائد شاہد حال ہیں، قصیدہ ان کے یہاں ایک ایسی نظم تھی جسے ہر ایک قسم کے خیالات کے اظہار کا آلہ قرار دیا جا سکتا تھا، قصیدہ میں عربی زندگی کے تمام شعبوں کی مختلف تصاویر ایک معین طریق پر مرتب کی جاتی تھیں، کسی قصیدہ کا مقصد خواہ کچھ ہی ہو لیکن شاعر مقررہ مراتب طے کئے بغیر اس تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا تھا۔

نسیب

نظم کا ابتدائی حصہ ''نسیب'' کے نام سے مشہور تھا، عرب شعراء قصیدہ کی ابتداء میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے، چنانچہ امرؤالقیس جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہنمیوں کا علم بردار اور جسے ادباء ''مقصد القصید'' کے گرامی لقب سے یاد کرتے ہیں، کہتا ہے

قفانبک من ذکریٰ حبیب و منزل — بسقط اللوی بین الدخول فحومل

وتوفا بها صحبی علی مطیهم — یقولون لا تهلک أسی و تجمل

و ان شفائی عبرة مهراقة — فهل عند رسم وارس من معول

آؤ میرے یارو! کچھ ٹھہرو کہ ہم تم مل جل کر رولیں، ایک دوست کے ذکر اور اس کی منزلوں کی یاد سے جو تو دہ ہائے

ریگ پیچیدہ پر مقام دخول اور حومل میں واقع ہیں، میرے دوست اپنی اپنی سواریوں کو میرے سر پر روکے کھڑے ہیں اور محبت سے کہتے ہیں کہ رنج والم میں جان اپنی نہ کھو اور دامنِ صبر کو اپنے ہاتھ سے مت دے، میں کیسے نہ روؤں کہ رونا ہی میری شفا ہے، پس! جی جان سے چاہتا ہوں کہ ان مٹنے والے نشانوں کے پاس تھوڑا سا رولوں۔

نسیب کے حصہ اول میں محبوب کے محاسن

بسا اوقات ''نسیب'' (ابتدائی حصے) کو لمبا کر کے محبوبہ کے محاسن کو پورے طور پر بیان کیا جاتا تھا، ہم معلقہ عنترہ سے اس امر کی وضاحت کرتے ہیں

وتستبیک بذی غروب واضح　　عذب مقبله لذید المطعم

وکان فاوۃ تاجو بقسیمة　　سبقت عوارضها الیک من الغم

او روضة انفا تضمن نبتها　　غیث قلیل الدمن لیس بمعلم

جاوت علیه کل بکر حرۃ　　فترکن کل قراوۃ کالدرهم

وتری الذباب بها یغنی وحده　　غرداً کفعل الشارب المترنم

(جب کی بات یاد کر) کہ وہ تجھ کو ایسے دانتوں کی لڑی دکھا کر پھانستی تھی جو تیز و باریک اور بہت اجلے چمکتے اور چومنے میں میٹھے اور بہت مزے کے تھے، یعنی جب وہ تیری طرف دیکھ کر مسکراتی تھی، اس کے حلقہ دہن کی بوئے خوش ایسی مہکتی ہے گویا کسی عطار کا مشک نافہ ایک حسین عورت کے پاس ہے، جس کی خوشبو اگلے دانتوں کے دکھائی دینے ہنسنے بولنے سے پہلے اس کے منہ سے تجھکو پہنچتی ہے، یا گویا ایسی ہری بھری چراگاہ ہے جس کو کسی چرندہ نے نہیں چرا اور بڑا بھاری مینہ اس کے بیل بوٹیوں کا ضامن ہوا اور گوبر کا نشان اس میں نہیں پایا گیا اور چلنے والوں سے محفوظ رہے ایک حسین عورت کے پاس ہے جس کے بو باس اس کے منہ سے نہارے نہار آتی ہے، (ایسی چراگاہ) جس پر پانی سے بھرے بادل اتنے برسے کہ ہر چھوٹے گڑھے کو روپے کی مانند چمکول کیا، شہد کی مکھی جو اچھی بو پر مرتی ہے، وہاں متصرف ہے کسی کو آنے نہیں دیتی اور خود کسی دم نہیں ٹلتی اور حال اس کا یہ ہے کہ متوالے گویے کی طرح اپنی موجوں میں گاتی رہتی ہے۔

نسیب کے درمیانی حصہ میں اونٹنی یا گھوڑے کی تعریف

اس کے بعد شاعر ہوش سنبھالتا ہے اور سفر کو جاری رکھتا ہے، اس موقع پر اپنی اونٹنی یا گھوڑے کی تعریف کرتا ہے اسے سرعت رفتار کی وجہ سے کبھی تو گورخر قرار دیتا ہے اور کبھی شتر مرغ کا ہم پایہ ٹھہراتا ہے اور کبھی اسے نیل گائے کے روپ میں ڈھالتا ہے لیکن بسا اوقات اس تشبیہ و تمثیل کے میدان سے نکل کر وہ ہمہ تن مشبہ بہ کی تصویر کی تکمیل میں لگ جاتا ہے جس کا بہترین نمونہ لبید کا مشہور قصیدہ ہے

وتضی فی وجه الظلام منیرۃ　　کجمانة البحری سل نظامها

حتی اذا نحسر الظلام و اسفرت　　بکرت تزل عن الثریٰ ازلامها

وتسمعت رزا لا نیس فراعها　　من ظهر غیب والانیس سقامها

فغدت کلا الفرحین تحسب انه　　مولی المخافة خلفها و امامها

حتی اذا یئس الرماۃ و ارسلوا غضفا دواجن قافلا اعصامھا
فلحقن و اعتکرت لھا مدریۃ کالسمھریۃ حدھا و تمامھا
لتذودھن و ایقنت ان لم تذو ان قداحم من الحتوف حمامھا
فتقصدت منھا کساب فضرجت بدم و غودر فی المکر سخامھا

وہ اندھیرے میں ایسی چمکتی تھی جیسے دریائی موتی جس کی لڑی کو باہر کھینچا جائے اور وہ گرتے ہوئے چمکے، رات تو اس نے جوں توں گذاری چنانچہ جب چاند غائب ہو گیا اور رات صبح میں داخل ہو گئی تو ٹھنڈے ٹھنڈے چل دی مگر گیلی زمین پر سم اس کے نہیں جمتے تھے، اُس نے کان دھر کر آدمی کی بھنک دور سے سنی چنانچہ اس بھنک نے غائبانہ اس کو چونکایا، اس لئے کہ وہاں کوئی آدمی نہ تھا اور آدمی اس کا بڑا روگ ہے، وہ ٹھنڈے ٹھنڈے میں چلدی اور یہ سمجھتی تھی کہ آگے پیچھے کو بچانا چاہئے اس لئے کہ یہی دونوں مار کی جگہ ہیں، وہ ایسی بھاگی کہ جب تیراندازوں نے یہ دیکھا کہ تیروں کی مار سے دور نکل گئی اور مایوس ہو گئے تو انہوں نے ایسے شکاری کتوں کو اس پر چھوڑا جن کے کان لٹکے ہوئے اور گردن میں پٹے تھے اور گھر کے کھائے کھلائے اور سکھائے بتائے ہوئے تھے، وہ کتے اتنے جھپٹے کہ اس کو جا دبایا مگر وہ ان پر ایسے سینگوں سے لپکی جو اپنی تیزی اور کمال میں ''سمہر'' لوہار کے نیزے کی تیزی رکھتے تھے، وہ گائے اس لئے ان پر لپکی کہ ان بلاؤں کو دفع کرے اور یہ سمجھ گئی کہ اگر نہ دفع کرے گی تو پھر اپنی خیر نہیں، ''کساب'' کتیا اس کے سینگوں سے بندھ گئی اور پھر ساری لہولہان ہو گئی اور ''سخام'' اس کا کتا مارا گیا اور میدان چھوڑ گیا۔

نسیب کے آخری حصے میں اصلی مقصد کی طرف رجوع

اس ضروری تمہید کے بعد شاعر اپنے اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے، جس کا نام اصطلاحِ ادباء میں تخلیص، تخلص یا مخلص ہے اور فارسی میں اسے ''گریز'' کہتے ہیں، شاعر اپنے سامعین کے سامنے بڑے عجیب وغریب پیرائے میں قبیلے کے معاشرتی حالات کا خاکہ کھینچتا ہے، شاعر اپنے ممدوح کے جود وسخا کی تعریف میں الفاظ کے دریا بہاتا ہے یا اس کی بہادری اور شمشیر زنی کی ستائش میں اپنے قلم کی تیغ کو بے دھڑک چلاتا نظر آتا ہے یا ایک واعظانہ اور حکیمانہ لہجہ میں اپنے ممدوح کے بدوی اخلاق کی پورے طور پر تصویر کھینچتا دکھائی دیتا ہے یا ایک تہدیدی لہجہ میں مخالف قبیلے کی مذمت کر کے انہیں مرغوب کرنا چاہتا ہے۔

جاہلی نظم زندگی کا جامع

جاہلی نظم عرب کے رسوم ورواج، عادات واخلاق، طرزِ معاشرت، خوبیوں، کمزوریوں، خانگی بود وباش، تمدنی حالت، تجارتی لین دین، مذہب اعتقادات، خیالات، جذبات وعواطف، اخلاقی ترقی، الغرض تمام ان امور کا آئینہ ہے جن کے مطالعے کی کسی مورخ یا ماہر اخلاقیات ومعاشرت کو ضرورت ہو سکتی ہے، اس کے عام موضوع لڑائیاں، خانگی زندگی، آبائی کارنامے، گھوڑے، اونٹ، ہتھیار، مہمان نوازی، حسن وعشق کے افسانے، ایام ہائے گذشتہ کی یاد، شرفاء کی مدح، خطابت، حب وطن، حب قوم کے کارنامے اور مراثی ہیں، جس میں مرنے والے کی اصلی اور واقعی اوصاف درج ہوتے ہیں، جاہلی نظم جاہلیت کی زندگی اور خیالات کی بولتی چالتی تصویر ہے، جس میں عربی زندگی کا حال بلاکم وکاست یا بڑھاؤ چڑھاؤ کے بیان کیا گیا ہے، الشعر دیوان العرب کے یہی معنی ہیں۔

مکمل عرب سورما نظم جاہلیت میں

زمانہ جاہلیت کی نظم دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک مکمل عرب سورما وہ شخص کہلاتا تھا جو بہادر، جری، شجاع، وفادار، مخلص اور صاف دل ہونے کے علاوہ چاق و چوبند، عاشق مزاج، سخی، مہمان نواز اور عشرت پسند ہو، باایں ہمہ دوپہر کی جلتی دھوپ، گھپ اندھیری رات اور کڑکتے ہوئے بادلوں کی موسلا دھار بارش میں سفر کا عادی، قمار باز، مال کو بے دھڑک تلف کرنے والا، نڈر، تلوار کا دھنی اور اپنے قبیلے کا غلطی اور راستی ہر حالت میں اخیر دم تک ساتھ دینے والا ہو۔

وھدانا الا من غزیة ان غوت غویت و ان ترشد غزیة ارشد

میں (قبیلہ) غزیہ ہی سے تو ہوں، اگر غزیہ ناراست چلیں تو بھی ان کا ساتھی ہوں اور اگر راست روی اختیار کریں تو بھی میرا مرنا جینا انہی کے ساتھ ہے۔

عرب سورما لڑاکا اور فخار ہوتا ہے جیسا کہ عمرو بن کلثوم کے معلقہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو غیر ضروری طور پر کبھی خطرے میں نہیں ڈالتا، جب نہ لڑنے سے کوئی نقصان نہ ہو تو الفرار فی وقة ظفر پر عمل کرتے نہیں شرماتا اور نہ ہی اسے عار سمجھتا ہے، لیکن قبیلے کی عورتوں (جو عموماً لڑائی میں قبیلہ کے ساتھ ہوتیں) کی آبرو بچانے کے لئے وہ اخیر دم تک لڑتا ہے، چنانچہ عمروؓ بن معدی کرب جو ایک مشہور یمنی جنگجو سردار تھے اور جنہوں نے اسلام لاکر فتوح سواد میں بڑا نام پایا، ایک موقع پر کہتے ہیں

لما رأیت نساء نا یفحصن بالمعزاء شدا

وبدت لمیس کانها بدر السماء اذا تبدا

وبدت محاسنها التی تخفی و کان الا مرجدا

نازلت کبشهم ولم ارمن نزال الکبش بدا

جب میں نے اپنی قبیلہ کی عورتوں کو دیکھا کہ وہ سراسیمہ وار پتھریلی زمین پر دوڑتی پھرتی ہیں، اور (میری بیوی) لمیس بھی اپنے حسن خداداد کے ساتھ اس طرح نمودار ہوئی جیسے نکھرے ہوئے آسمان میں چودھویں رات کا چاند اور اپنے بے حجاب چہرے کے ساتھ جو کبھی بے نقاب نہیں ہوا تھا، گھبرائے پھرتی تھی اور حالت نازک ہوگئی، تو ایسی حالت میں، میں سردار قوم کے مقابلہ کے لئے اتر آیا اور مقابلہ کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔

جاہلی شجاعت و مردانگی کا نمونہ

جاہلی شجاعت، بہادری اور مردانگی کا نمونہ شنفری ازدی اور اس کا ساتھی تابط شراً خیال کئے جاتے ہیں، شنفری نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا، لہٰذا اس کی قوم نے دشمنوں کے خوف کی وجہ سے اس کے جلاوطن ہونے کا اعلان کر دیا، دشمن ہر طرف سے للکارتے اور دھمکیاں دیتے اور اپنے اپنے مقتولین کے بدلہ لینے کی قسمیں اٹھاتے مگر وہ انہیں محض گیدڑ بھبکیاں سمجھ کر تن تنہا مخالفین کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر اپنے قبیلے کو بزدلی پر کوستا ہے

لاتقبرونی ان قبری محرم علیکم ولاکن البشری ام عامر

اذا احتملوا رأسی و فی الرأس اکثری وغودر عند الملتقی ثم سائری
هنالک لا اجور حیاۃ تسرفی سجلیس اللیالی مسلاً بالجرائر

مجھے مٹی میں دفن نہ کرنا کیونکہ میرا دفن کرنا تم لوگوں پر حرام ہے!، ہاں اولگڑ بگڑ! خوش ہو (کہ تجھے میرا گوشت نصیب ہوگا)، جب دشمن میرا سر کاٹ کر اٹھالے جائیں گے اور سر ہی میں میرا اکثر حصہ ہے اور میرا دھڑ میدان جنگ میں پڑا رہے گا، تب میں جو اپنے تمام جرموں کی پاداش بھگتنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہوں آئندہ زندگی سے خوشی کی کیا توقع کرسکتا ہوں؟

اغربۃ العرب کون؟

تابط شراً ثابت بن جابر بن سفیان فهمی جو اغربۃ العرب میں شمار کیا جاتا ہے، ایک مشہور ڈاکو اور قزاق تھا، وہ اپنے یہاں مردانگی کے معیار کا مختصر مگر کرخت الفاظ میں یوں مرقع پیش کرتا ہے

قلیل التشکی للمهم یصیبه کثیر الهوی شتی النوی والمسالک
یظل بهوماۃ ویمسی بغیرها جحلیشا و یعرودی ظهور المهالک
ویسبق وفد الریح من حیث ینتحی بمنخرق من شده المتدارک
اذا حاص عینه کوی النوم لم یزل له کالئی من قلب شیخان فاتک
یری الوحشۃ الانس الانیس و یهتدی بحیث اهتدت ام النجوم الشوابک

وہ مصائب پر کم شکایت کرنے والا، ولولوں اور امنگوں سے پُر اور ہزاروں ارادے دل میں چھپائے ہوئے ہے، دن اس جنگل میں تو شام دوسرے میں، تن تنہا، خطرناک مواقع پر بے دھڑک جا پڑتا ہے، دوڑنے میں تند ہوا سے بھی آگے گذر جاتا ہے، جہاں سے بھی چلے، اگر کبھی ہلکی نیند سو بھی جائے تو اس کا چوکنا دل محافظ کھڑا رہتا ہے، تنہائی اس کی انیس و ہمدم ہے، وہ پروین کی طرح اپنے راستہ کو بھی گم نہیں کرتا۔

نظم جاہلیت میں ایثار و وفاداری کے اخلاق

زمانہ جاہلیت کی نظم میں ایثار اور وفاداری کے اخلاق بھی نمایاں نظر آتے ہیں، چنانچہ اپنے دوست یا ہمسایے سے مردانہ وار عہد پروری اور بے غرض ایثار کے لیے عرب آج تک شہرۂ آفاق ہیں، وفاداری کے حوالے سے قدیم شعراء کے ہاں سموئل بن عادیا یہودی کا نام زبان زدِ خلائق ہے، چنانچہ محاورۃً کہا جاتا ہے اوفاء من السموئل (یعنی سموئل سے بھی زیادہ وفادار)، کیونکہ اس نے ایک موقع پر مشہور کندی شاعر امرؤالقیس کی زرہوں میں (جو اس نے اپنے باپ کے قاتل قبیلہ بنو اسد کے برخلاف قسطنطنیہ کے دربار سے مدد لینے جاتے وقت سموئل کے پاس قلعہ الابلق میں بطور امانت چھوڑیں تھیں) خیانت گوارا نہ کی، حتیٰ کہ اپنے بیٹے کا قلعہ کی دیواروں کے نیچے سر اڑتا دیکھ کر بھی یہ شخص جادۂ وفا سے سرِ مُو نہ بھٹکا، چنانچہ وہ فخریہ کہتا ہے

وفیت بادرع الکندی انی اذا ماذم اقوام وفیت
واوصی عادیا یومابان لا تهدم یا سمؤل ما بنیت

میں نے کندی کی امانتی زرہوں میں خیانت کو جائز نہ رکھا اور اپنے عہد کو پورا کیا، جبکہ اور لوگ بدعہدی سے بدنام ہو جاتے ہیں، مجھے میرے باپ عادیا نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ دیکھنا کہیں میرے بنا کردہ مینارِ شرافت کو ڈھا نہ دینا!

جود وسخا کا نمونہ

عرب میں جود وسخا کا نمونہ حاتم طائی ہے، اس شخص کا نام چار دانگ عالم میں جواں مردی کے لئے مشہور ہے حتیٰ کہ شیخ شیرازؒ نے بھی اس کی فراخ دلی کے گیت گائے ہیں۔

زبنگاہِ حاتم یکے نیک مرد — طلب دہ ورم سنگ فانیز کرد
زراوی چنیں یاد دارم خبر — کہ پیشش فرستاد تنگ شکر
زن از خیمہ گفت ایں چہ تدبیر بود — ہمہ دہ ورم حاجتِ پیر بود

جس پر حاتم نے جواب دیا:

گر او در خورِ حاجت خویش خواست — جوانمردیٔ آلِ حاتم کجا است

وہ خود اپنی بیوی ماویہ بنت عبداللہ بن مالک سے یوں خطاب کرتا ہے

اذا ماصنعت الزادفا لتمسی له — اکیلا فانی لست اکله وحدی
اخا طارقا اوجاربیت فاننی — اخاف مذمات الاحادیث من بعدی
و انی لعبد الضعیف ما دام ثاویا — وما نی الا تلک من شیمة العبد

جب تو کھانا تیار کرے تو کسی ایسے شخص کو بھی بلا جو کھانے میں میرا شریک ہو سکے کیونکہ میں اکیلے نہیں کھا سکتا، یعنی کسی رات آنے والے بھائی یا پڑوسی کو (بلا لے) کیونکہ میں برا نام نہیں چھوڑنا چاہتا، میں مہمان کا غلامِ بے دام ہوں اور غلامی کا ایک یہی وصف مجھ میں پایا جاتا ہے۔

حمیةّ الجاهلية

آخر میں ہمیں اہل عرب کے بدلے اور کینے کی خصلت کا ذکر کرنا ضروری ہے جو ایک مجبوری تصور کی جاتی اور جس کا بوجھ ان کے ضمیر پر ہمیشہ پڑا رہتا، حمیةّ الجاهلية سے یہی مراد ہے، انتقام اور بدلہ ایک طبعی ضرورت سمجھی جس کے پورا نہ ہو چکنے تک انتقام لینے والے شخص کو نہ ہی نیند آتی نہ ہی کھانے پینے کا مزہ آتا بلکہ یہ خیال بیماری کی طرح اس کے گلے کا ہار بنا رہتا، چنانچہ قیس بن زهیر العبسی کہتا ہے۔

شفیت النفس من حمل بن بدر — وسیفی من حذیفة قد شفانی

میں نے حمل بن بدر کا کام تمام کر کے اپنے جی کو ٹھنڈا کیا اور میری تلوار نے مجھے حذیفہ کے روگ سے نجات بخشی۔

مقتول کا سب سے قریبی رشتہ دار جس پر انتقام لینا فرض ہوتا، عیش وعشرت منانے ناچ ورنگ میں حصہ لینے، شراب پینے، غرضیکہ تمام لذائذ نفسانی سے کنارہ کش رہتا اور جب تک اپنے چچا، بھائی، باپ، ماموں، بیٹے کا بدلہ قاتل یا اس کے کسی قریبی رشتہ دار

سے نہ لے لیتا اس کے دل کی جلن ٹھنڈی نہ ہوتی، لیکن اگر کوئی شخص قصاص کی جگہ دیت پر (جس میں اونٹنیاں دی جاتیں) راضی ہو جاتا تو تمام سوسائٹی اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنا لیتی کیونکہ اس نے خون پر دودھ کو ترجیح دی، چنانچہ ایک شاعر فخریہ کہتا ہے

ولکن ابی قومی اصیب اخوهم رضی العار فاختاروا علی اللبن الدما

مگر میری قوم نے جن کا عزیز بھائی مارا گیا تھا خوں بہا کی عار قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دودھ پینا منظور نہ کیا،

ایک شخص جسے سات خون بہا پیش کئے گئے مگر اس نے انتقام ہی کو ترجیح دی، کہتا ہے

ابعد الذی بالنعف نعف کویکب وهینة رمس ذی تراب و جندل

أذکر بالبقیا علی ما اصابنی وبقیای انی جاهد غیر مؤتل

کیا اس عزیز کے مارے جانے کے بعد جو مقام نعف کویکب پر ریت اور کنکر والی قبر میں مدفون ہو چکا ہے، مجھے قاتل پر رحم کرنے اور انتقام سے دستبردار ہونے کی تلقین کی جاتی ہے، میرا رحم تو یہی ہوگا کہ میں اپنی مرضی کے انتقام لینے سے کوتاہی نہ کروں!

جاہلی نظم محسوسات باطنی و خارجی سے معمور

قصہ کوتاہ جاہلی نظم کے مضامین افقِ عرب کے اندر ہی محدود ہیں، اس کے خیالات بدوی تمدن کی فضا سے معمور ہیں، چنانچہ یہ صحرائی زندگی کی یکسانیت، واقعیت اور کیفیات نفسانیہ کے باریک فرق سے معریٰ ہیں، کیونکہ کشمکش حیات مادی زندگی کے مشاغل کو چھوڑ کر عقل و فہم میں توجہ لگانے کا ہرگز موقع نہیں دیتی، اسی وجہ سے بدوی زندگی کو جدت آفرینی سے کچھ واسطہ نہیں، پھر بھی جاہلی نظم رسیلی، دلسوز، جذبات سے معمور ہے، جاہلی نظم تمام محسوسات باطنی سے ہٹ کر محسوسات خارجی سے تعلق رکھنے والی، تشبیہات، استعارت اور کنایات سے مالا مال، مگر خیالات جدیدہ سے عاری ہے، تاہم ہمیں قدیم عربی شاعری کو بیسویں صدی کے معیار پر نہیں پرکھنا چاہیے کیونکہ قدیم عرب نے ہم صدیوں بعد میں آنے والے عجمیوں کو خوش کرنے کے لئے بلکہ اپنے فوری فطرتی جذبات کے اظہار کے لئے اپنے اشعار میں اپنے بس کی تمام رنگ آمیزی کو صرف کر دیا ہے، اگرچہ معائب و ہاں محاسن اور خار و گل پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں مگر کوئی ادیب کسی زبان کے ادبیات کے ہر دو پہلوؤں کا پورا اندازہ کیے بغیر محقق کہلانے کا مستحق نہیں۔

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

نفی حکمت مکن از بہرِ دلِ عامے چند

مولانا عبدالرؤف بادشاہ
مدیر مسئول سہ ماہی الصدیق

سود ایک روحانی اور مادی وباء

(قرآن اور حدیث کی روشنی میں)

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور شروع سے اعتدال کی تعلیم دیتا چلا آرہا ہے، یہاں نہ تو عیسائیت، ہندومت اور بدھ مت کی طرح صرف رہبانیت کی تعلیم دی جاتی ہے اور نہ موجودہ سیکولر طبقات کی طرح انسان کو مادی خواہشات کا غلام بنایا جاتا ہے، اسلام نے ایک طرف انسانوں کی دنیوی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مادیت کے فلسفے کو اعتدال کے ساتھ تسلیم کیا ہے، اور دوسری طرف اخروی مسائل کے حل کے لیے روحانیت کو اہم مقام دیا ہے۔

لیکن اسلام نے اِن دونوں کرداروں (روحانیت اور مادیت) کو بخوبی سرانجام دینے کے لیے کچھ قوانین اور ضوابط وضع کئے ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے، کہ اسلامی قوانین پر عمل کرنے سے بھلے آخرت کا فائدہ ہو، لیکن دنیا میں اِن قوانین پر عمل پیرا ہونے سے اسلامی معاشرہ دوسرے معاشروں سے پیچھے رہ جاتا ہے، اِس خیال کا حقیقت سے کتنا تعلق ہے؟ اِس کا مذکورہ مضمون میں جائزہ لیا جائے گا اور بطورِ مثال سود اور زکوۃ وصدقات کے بارے اسلام کے قوانین پر عمل کرنے اور نہ کرنے کے دنیاوی فوائد اور نقصانات کا تذکرہ قرآن اور احادیث کی روشنی میں کیا جائے گا۔

اِس مضمون کا اصل ہدف چونکہ سود اور زکوۃ کے دنیوی فوائد اور نقصانات بیان کرنا ہے، اِس لیے اخروی سزا اور جزا کا تذکرہ نہیں کیا جائے گا، اِس لیے کہ سودی معاملہ کرنے والے یا تو آخرت کی جزا اور سزا کا یقین نہیں کرتے، یا پھر عملاً دنیوی نفع اور نقصان کو اخرت کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں اور اِس لیے بھی کہ سودی معاملہ کرنے والوں کے نزدیک سود نہ کرنے سے آدمی دوسرے لوگوں سے معاشی لحاظ سے پیچھے رہ جاتا ہے، جبکہ معاملہ اِس کے برعکس ہے، ذیل میں سود کے بعض نقصانات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

مال کی کمی اور بے برکتی کا سبب

سود کا مال دیمک کی طرح دوسرے سرمایہ کو کھاتا رہتا ہے، سودخور بظاہر اپنے مال میں اضافہ کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، لیکن انجامِ کار یہی سودی اضافہ اپنے ساتھ اصل سرمایہ کو بھی ڈبو دیتا ہے، اِس کی ایک زندہ اور تازہ مثال چند سال پہلے مضاربت کے نام سے شروع کیا گیا ایک سودی معاملہ بھی ہے، جس میں ارباب الاموال اپنے اصل سرمایہ سے بھی ہاتھ دو بیٹھے، کاغذات اور اسٹامپ پیپر کے حد تک تو ہر رب المال کے پاس لاکھوں کروڑوں روپے کا سرمایا پڑا ہوا ہے، لیکن وہ اپنے سرمایے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اِس کو مال کی بے برکتی کہتے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ(۱)

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے،

حافظ ابن کثیرؒ اِس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

يخبر الله تعالى أنه يمحق الربا، أي: يذهبه، إما بأن يذهبه بالكلية من يد صاحبه، أو يحرمه بركة ماله فلا ينتفع به(۲)

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہے کہ: سود پورے مال کو ختم کردیتا ہے، یا اُس کو مال کی برکت سے ایسا محروم کردیتا ہے، کہ پھر وہ اپنے مال سے کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتا،

امام احمد بن حنبلؒ نے یہی مضمون رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے ثابت کیا ہیں،

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: إن الربا وإن كثر فإن عاقبته تصير إلى قل(۳)

سود کا مال اگرچہ بظاہر زیادہ نظر آتا ہے، لیکن انجامِ کار کم ہوتا رہتا ہے،

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سود خور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے، مگر وہ بڑھنا ایسا ہے، جیسے کسی انسان کا بدن ورم سے بڑھ جائے، ورم کی زیادتی بھی بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھ دار انسان اِس زیادتی کو پسند نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے، کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اِس طرح سود خور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے مگر مال کے فوائد وثمرات یعنی راحت وعزّت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے(۴)

اِس کے بالمقابل زکوۃ اور صدقات سے مال بڑھتا رہتا ہے، ہر چیز کو مادی نظر سے دیکھنے والوں کو صدقات سے مال کم ہوتا نظر آتا ہے، لیکن اسلام چونکہ مادیت اور روحانیت کا حسین امتزاج ہے، اِس لیے وہ صرف مادیت سے بحث نہیں کرتا، بلکہ ہر عمل میں روحانیت کے پہلو کو بھی مدِ نظر رکھتا ہے، صدقہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

إن الله يقبل الصدقة ويأخذها بيمينه فيربيها لأحدكم كما يربي أحدكم مهره (۵)

یقیناً اللہ تعالیٰ صدقہ کو اچھی طرح قبول کرکے تمہارے لیے اُس میں ایسا اضافہ کرتا ہے، جیسے تم گھوڑوں کی نسل کو بڑھاتے رہتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے صدقہ سے مال کے بڑھنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۶)

جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، اُن کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک دانہ سات بالیں اگائے، اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے ثواب میں کئی گنا اضافہ کردیتا ہے، اللہ بہت وسعت والا اور بڑے علم والا ہے،

امام رازیؒ اِس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أن المقصود من الاية أنه لو علم إنسان يطلب الزيادة والربح أنه إذا بذر حبة واحدة أخرجت له سبعمائة حبة ما

كان ينبغي له ترك ذلك ولا التقصير فيه فكذلك ينبغي لمن طلب الأجر في الاخرة عند الله أن لا يتركه إذا علم أنه يحصل له على الواحدة عشرة ومائة، وسبع مائة (۷)

اِس آیت سے مقصود یہ ہے، کہ اگر ایسے انسان کو پتہ چلے، جو زیادتی اور نفع کی تلاش میں ہو، کہ ایک دانہ بونے سے سات سو دانے اُگے گے، تو پھر اُس کے لیے یہ عمل چھوڑنا یا اِس میں کوتاہی کرنا مناسب نہیں ہے، اسی طرح جو آدمی آخرت میں اللہ تعالیٰ سے اجر اور ثواب کا طلب گار ہو، اُسے بھی اگر معلوم ہو جائے، کہ ایک کے بدلے دس، سو یا سات سو ملے گے، تو وہ صدقہ دینا نہیں چھوڑے گا۔

انسانیت کی ذلت اور رسوائی کا سبب

سود دینے والا ہمیشہ ذلت اور رسوائی میں زندگی گزارتا ہے، موجودہ زمانے میں حکومتیں حکومتوں سے سود پر قرض لیتی ہیں، اور اُس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ سود پر قرض لینا والا ملک دینے والے ملک کی کالونی بن جاتا ہے، قرض لیتے وقت قرض دینے والا ملک جو شرائط لگاتا رہتا ہے، قرض لینے والا ملک سارے شرائط کو من وعن تسلیم کرتا ہے، بصورتِ دیگر قرض ہی نہیں ملتا۔ یُوں قرض دینے والا ملک جس قسم کا قانون قرض دار ملک پر لگانا چاہے، لگا سکتا ہے، قرض دار ملک کے جس جس ادارے کو وہ اپنی تحویل میں لینا چاہے، لے سکتا ہے، جس نوعیت اور جتنی مقدار کے ٹیکس قرض دینے والا لاگو کرنا چاہے، لاگو کر سکتا ہے اور قرض دار ملک قرض دینے والے ملک کے ایک اشارۂ چشم پر ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتا ہے اِس پوری صورتِ حال میں قرض دار ملک کی ذلت اور رسوائی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے، وہ فرماتے ہیں:

اپنے ملک کی بنیوں اور یورپ وافریقہ، مصر وشام کے یہودیوں کی تاریخ پڑھ جایئے، اِن کے حالات کو دیکھ لیجئے، اِن کی تجوریاں کتنے ہی سونے چاندی اور جوہرات سے بھری ہوں لیکن دنیا کے کسی گوشے میں انسانوں کے کسی طبقے میں اِن کی کوئی عزت نہیں، بلکہ اِن کے اِس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ عوام کے دلوں میں اِن کی طرف سے بغض ونفرت پیدا ہوتی ہے، اور آج کل تو دنیا کی ساری جنگیں اسی بغض ونفرت کے مظاہرے ہیں، محنت اور سرمایہ کی جنگ نے دنیا میں اشتراکیت اور اشتمالیت کے نظریہ پیدا کئے، کمیونزم کی تخریبی سرگرمیاں اسی بغض ونفرت کا نتیجہ ہیں، جن سے پوری پوری دنیا قتل وقتال وجنگ وجدال کا جہنم بن کر رہ گئی ہے (۸)

ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

پھر جب قرض دار ملک کی طرف سے ادائیگی میں مسلسل کوتاہی صادر ہونے لگتی ہے، تو بیرونی قرض خواہ اس پر الزام لگانا شروع کر دیتے ہیں، کہ یہ بے ایمان ملک ہے، ہمارا روپیہ کھا جانا چاہتا ہے اِن کے اشاروں پر اِن کے قومی اخبارات اِس غریب ملک پر چوٹیں کرنے لگتے ہیں، پھر اِن کی حکومت بیچ میں دخل انداز ہوتی ہے، اور اپنے سرمایہ داروں کے حق میں اِس پر سیاسی دباؤ ہی ڈالنے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ اِس کے مشکلات کا ناجائز فائدہ بھی اٹھانا چاہتی ہے (۹)

افراد کے قرضوں کی مثال بھی اِس سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا، سود پر قرض دینے والا قرض دار سے جو مطالبہ کرتا ہے، قرض دار اُس کو بے سوچے سمجھے پورا کرتا ہے۔

اخلاقیات کو پامال کرنے کا سبب

اسلام انسانوں کے لیے ایسا معاشرہ چاہتا ہے، جو رحم دلی، محبت، ایثار، تعاون اور بھائی چارے کی بنیاد پر قائم ہو، ایک ایسا معاشرہ جس میں لوگ ایک دوسرے کی مدد کرے، غریبوں اور بے کسوں کو سہارا دے، دوسرے کے نفع کو اپنا نفع اور دوسرے کے نقصان کو اپنا نقصان تصور کرے، خودغرضی کو ترک کر کے اجتماعی مفاد کو سامنے رکھے، تاکہ انسانیت شرافت اور کمال میں انتہاء تک پہنچ جائے، اور اشرف المخلوقات کے خطاب کا مستحق بن جائے۔

لیکن سود انسان میں بُرے اخلاق کی ایسی نشونما کرتا رہتا ہے، کہ رفتہ رفتہ سود خور انسان اخلاقِ سیئہ کی انتہاء تک پہنچ جاتا ہے، بُرے اخلاق کی ایک لمبی فہرست ہے اور سود خور میں اُس فہرست کی ہر اکائی پیدا ہوجاتی ہے، لالچ، خودغرضی، بے رحمی، سنگ دلی، کنجوسی، حسد، بغض اور بزدلی جیسے صفات اُس کی فطرت بن جاتی ہیں، اُسے اِس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، کہ غریب مقروض کو نفع ہوا یا نقصان؟ اور نفع ہوا بھی تو کتنی مدت میں اور کس قدر مشقت کے بعد؟ اُسے تو دیئے ہوئے قرض پر سود چاہیے، جس کو جدید دنیا نے ''نفع'' کا نام دیا ہوا ہے، حالانکہ نفع تو ہوا ہی نہیں، بلکہ مقروض تو نقصان پہ نقصان اٹھا رہا ہے، ایسے معاشرے میں کوئی سرمایہ دار کسی غریب کو بغیر سود کے قرض کیوں دے! جبکہ اُسے معاشرے میں ایسے ادارے اور تاجر بآسانی مل سکتے ہو، جو اِس سود خور کو ہر مہینے کے آخر میں اِس قرض پر معین سود (نفع) دیتا ہو۔

اسلام ایسی خودغرضی اور سنگ دلی کی مذمت کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو اجتماعی مفاد اور رحم دلی کی تعلیم دیتا ہے، سود کی حرمت کے لیے اگر دوسرے دلائل نہ بھی ہو، تو صرف یہ خودغرضی اور سنگ دلی بھی اُس کی حرمت کے لیے کافی ہیں، مغرب کی منافقت ملاحظہ کیجئے، کہ وہ ویسے تو انسانیت کی فلاح اور بہبود کے خوش نما نعرے لگاتا رہتا ہے، لیکن سود میں انہیں یہی قباحتیں نظر نہیں آتی، جو سراسر انسانیت کی فلاح اور بہبود کے منافی ہیں، وہ پہلے غریبوں کا خون چوستے ہیں، اور پھر انہی چوسے ہوئے خون سے غریبوں کے لیے ہسپتالیں اور سڑکیں بنانے کے منصوبے بناتے ہیں۔

یہی خودغرضی ترقی کر کے لالچ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور پھر مرحلہ وار حسد، کینہ اور بغض سے ہوتے ہوئے جنگ پر منتج ہوجاتی ہے۔

اِس کے مقابلہ میں صدقہ اور خیرات آدمی کے اندر اچھی صفات کو فروغ دیتا ہیں، صدقہ دینے والا اِس کوشش میں لگا رہتا ہے، کہ کہیں کوئی نادار اور مصیبت زدہ مل جائے تاکہ اُس کی مدد سے اپنی روح کو تسکین دے سکے، وہ رحم دلی اور ایثار کی صفت سے ایسا لبریز ہوتا ہے، کہ اپنی ذاتی مفاد کو مؤخر کر کے دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۱۰)

اور اُن کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے اُن پر تنگ دستی کی حالت گزر رہی ہو اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہوجائیں، وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

اِس آیت سے معلوم ہوگیا، کہ ایثار سے بخل خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

خصلتان لا یجتمعان في مؤمن البخل و سوء الخلق (۱۱)

دو خصلتیں کسی مؤمن میں جمع نہیں ہوسکتی، ایک بخل اور دوسرا بُرے اخلاق،

اِس پوری تفصیل یہ بات ثابت ہوگئی، کہ سودی معاملہ کرنے والے دنیاوی لحاظ سے بھی دوسرے اقوام سے پیچھے رہ جاتے ہیں، انسان کئی مقاصد کے لیے مال کماتا ہے، جن میں مال کا اضافہ، عزت، چین، سکون اور بوقتِ ضرورت دوسرے کی امداد سرِ فہرست ہیں، لیکن سود خور کو اِن مقاصد میں سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ سودی پیسہ آدمی کا سارا چین، آرام، سکون، عزت، مال میں برکت اور دوسروں کے کام آنا بلکل ناپید کر دیتا ہے، اور انسان کو ایک خودغرض، لالچی اور سنگ دل جانور کی طرح بنا دیتا ہے، البتہ زکوۃ اور صدقات سے یہ سارے فوائد یقینی اور احسن طریقے سے حاصل ہوتے ہیں۔

مصادر و مراجع

(۱) البقرۃ:۲۷۶

(۲) ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل بن عمر، تفسیر ابن کثیر، دار الطیبۃ، بیروت، ج ۱ ص ۷۱۳

(۳) امام احمد ابن حنبل، ابوعبداللہ احمد بن محمد، مسند احمد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ج ۶ ص ۲۹۷، رقم: ۳۷۵۴

(۴) مفتی محمد شفیع، مسئلۂ سود، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ص ۵۵

(۵) امام ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، سنن الترمذی، دار الغرب الاسلامی، بیروت، ج ۲ ص ۴۳، رقم: ۶۶۲

(۶) البقرۃ:۲۶۱

(۷) امام فخر الدین رازی، ابوعبداللہ محمد بن عمر، تفسیر کبیر، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ج ۷ ص ۴۰

(۸) مسئلۂ سود، ص ۵۶-۵۷

(۹) سید ابوالاعلیٰ مودودی، سود، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ص ۹۴

(۱۰) الحشر:۹

(۱۱) امام بخاری، محمد بن اسماعیل، الأدب المفرد، دار البشائر الاسلامیۃ، بیروت، ص ۱۰۶، رقم: ۲۸۲

جوادعلی شاہ حقانی

معہد امام ابوحنیفہ دوبیان صوابی

امام طحاویؒ کی کتاب شرح مشکل الاثار: ایک تعارف

مصنف کا تعارف:

الامام أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن سلمة بن عبدالملک الازدی الحَجری المصری الطحاوی. الازدیه: عرب کے قبائل میں سے ایک بڑا اور مشہور قبیلہ ہے، یہ الازد بن الغوث بن نبت بن مالک بن زید بن کھلان کی طرف منسوب ہے، الحجری یہ ازد کی ایک شاخ ہے اور حجر بن جزیلۃ بن لخم کی طرف منسوب ہے اور الطحاوی طحا قریہ کی طرف منسوب ہے۔

امام طحاویؒ والد کی طرف سے قحطانی اور والدہ کی طرف سے عدنانی ہیں، آپ کی والدہ ماجدہ اصحاب شوافع میں سے امام مزنیؒ کی بہن تھیں، اور قبیلہ مزینہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

آپؒ ۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے، یہ جمہور کا قول ہے اور صحیح ہے، البتہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں ۲۳۸ھ ذکر کیا ہے، اور اس کے بعد سمعانی سے نقل کیا ہے کہ امام طحاویؒ کی پیدائش ۲۲۹ھ کو ہوئی، اور پھر اس روایت اخیرہ کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن یہ تحریف ہے، جس کو بعد میں آنے والوں نے نقل کیا ہے اور سمعانی کی کتاب کی طرف رجوع نہیں کیا ہے، بہرحال درست قول ۲۳۹ھ ہی ہے،

امام طحاویؒ کا زمانہ تدوین حدیث اور سنت مطہرہ کی خدمت کا زرخیز زمانہ تھا، جس میں بڑے بڑے کبار محدثین پیدا ہوئے، اور علم حدیث کو مختلف بلاد اسلامیہ میں پھیلا دیا، چنانچہ جب امیر المؤمنین امام بخاریؒ اس دنیا سے رحلت کر گئے، تو آپؒ کی عمر ۱۷ سال تھی اور جب امام مسلمؒ نیشاپوری اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو آپؒ کی عمر ۲۲ سال تھی اور جب امام ابوداؤدؒ سجستانی وفات پا گئے تو آپؒ کی عمر ۳۶ سال تھی اور جب أبوعیسی الترمذیؒ انتقال کر گئے، تو آپؒ کی عمر ۴۰ سال تھی، اور جب احمد بن شعیب النسائیؒ فوت ہو گئے تو آپؒ کی عمر ۶۴ سال تھی اور جب محمد بن یزید بن ماجہؒ دار ابدی کی طرف چل بسے تو آپؒ کی عمر ۳۴ سال تھی۔

امام طحاویؒ کا گھرانہ علمی گھرانہ تھا، آپؒ کے والد محترم بڑے صاحب علم وبصیرت والے تھے اور آپؒ کے ماموں امام مزنیؒ اصحاب شوافع میں سے بڑے فقیہ تھے، آپؒ نے حفظ کی تکمیل أبوزکریا یحییٰ بن محمد عمروسی سے کی، اس کے بعد فقہ اور احادیث اپنے ماموں امام مزنیؒ سے حاصل کیا۔

مذہب حنفی کی طرف تحول

امام طحاویؒ جب بیس سال کو پہنچے تو مذہب شافعی کو چھوڑ کر مذہب حنفی کو اختیار کیا، علماء نے اس تحول کے کئی وجوہات لکھی ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں:

☆ امام طحاویؒ نے اپنے ماموں (امام مزنیؒ) کو کئی دفعہ دیکھا تھا کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں دیکھتے تھے، جیسا کہ علامہ خلیلی نے الارشاد میں لکھا ہے سمعت عبد اللّٰہ بن محمد الحافظ سمعت محمد بن أحمد الشروطی یقول : قلت للطحاوی لم خالفت مذهب خالک واخترت مذهب أبی حنیفة ؟فقال :لأنی کنت أری خالی تدیم النظر فی کتب أبی حنیفة، فلذلک انتقلت الیه۔

☆ دوسری وجہ دونوں مذاہب میں مختلف فیہا مسائل میں لکھی گئی تصانیف ہیں مثلاً امام مزنیؒ نے المختصر کتاب لکھی جس میں انہوں نے امام ابوحنیفہؒ پر رَد کیا، اس کے مقابلے میں قاضی بکار بن قتیبہ نے کتاب لکھ کر امام اُبوحنیفہؒ کا دفاع کیا۔

☆ مصر میں قضاء کے عہدے کے لئے جو شیوخ آتے، تو اپنی نسبت امام ابوحنیفہؒ کی طرف کرتے، جیسے قاضی بکار بن قتیبہ، ابن ابی عمران، اُبوحازم وغیرہ۔

ابن عساکر نے ''تاریخ مدینۃ دمشق'' میں امام طحاویؒ کا قول نقل کیا ہے:

أول من کتبت عنه المزنی وأخذت بقول الشافعی فلما کان بعد سنین قدم أحمد بن أبی عمران قاضیا علی مصر فصحبته وأخذت بقوله وکان یتفقه للکوفیین وترکت قولی الأول فرأیت فی المنام وهو (المزنی) یقول لی :یاأبا جعفر اغتصبک یاأبا جعفر اغتصبک،

یعنی اول فقہ وحدیث میں نے اپنے ماموں امام مزنیؒ سے حاصل کر کے امام شافعیؒ کا قول اختیار کیا، لیکن جب قاضی احمد بن ابی عمران آئے، تو میں اس کی مجلس میں بیٹھ گیا اور اس کا قول اختیار کیا، اور قول اول ترک کر دیا، اس کے بعد مجھے اپنا ماموں (امام مزنیؒ) خواب میں آئے اور کہنے لگے: اے ابوجعفر! اس نے تجھے غصب کر دیا، اس نے تجھے غصب کر دیا،

بہر حال تحول کے یہ سارے اسباب امام طحاویؒ کی استعدادی اور فطری تھے، جس نے امام طحاویؒ کو دونوں مذاہب کی گہرائی تک لے جا کر مرتبہ اجتہاد تک پہچا دیا، اور دونوں مذاہب کے موازنہ کے بعد مذہب حنفی کو اختیار کیا،

علماء کے ہاں امام طحاویؒ کا مقام

قال ابن الندیم فی الفهرس :وکان أوحد زمانه علماًوزهداً۔

امام طحاویؒ اپنے زمانے میں علم وزہد کے اعتبار سے منفرد تھے۔

قال ابن عبدالبر : کان من أعلم الناس بسیر الکوفیین وأخبارهم وفقههم.

کوفیین کے سیر اور ان کے اخبار وفقہ کے زیادہ جاننے والے تھے۔

قال ابن الأثیر فی اللباب: کان إماما، فقیها من الحنفیین، وکان ثقة ثبتا۔

احناف کے امام اور فقیہ تھے اور ثقہ تھے۔

قال الامام الذهبی فی السیر :الامام العلامة، الحافظ الکبیر، محدث الدیار المصریة فقیها.....ثم قال :ومن نظر فی توالیف هذاالامام علم محله من العلم وسعة معارفه.

جو بھی امام طحاویؒ کی تالیفات دیکھے گا، تو اس شخصیت کا علم اور وسعتِ معرفت جان لے گا۔

قال البدر العینی فی نخبة الأفکار: أما الطحاوی فإنه مجمع علیه فی ثقته ودیانته وأمانته وفضیلته التامة ویده الطولی فی الحدیث وعلله وناسخه ومنسوخه.....ولقد أثنی علیه السلف والخلف۔

ہر چہ امام طحاوی ہیں، تو اس کی ثقہ ہونے، اس کی دیانت وامانت، کامل فضیلت اور حدیث کے علل اور اس کے ناسخ و منسوخ میں مہارت پر لوگوں کا اتفاق ہے، اور تمام سلف وخلف نے ان کی تعریف کی ہے۔

ان کے علاوہ بیسیوں علماء نے آپ کی علمیت کا اعتراف کیا ہے، البتہ بعض علماء (امام بیہقی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہ) نے امام طحاویؒ پر بعض مسائل کی بناء پر جرح کی ہے، جن سے علماء نے جوابات کئے ہیں۔

امام طحاوی کی کتاب شرح مشکل الاثار

امام طحاویؒ کی یہ کتاب شرح مشکل الاثار نام سے طبع ہوئی ہے، لیکن اس کا اصل نام بیان مشکل الاثار ہے جیسا کہ شیخ حاتم شریف نے اس کی تصریح کی ہے، یہ کتاب ان عظیم کتابوں میں شمار ہوتی ہے جو سنت مطہرہ کی دفاع، اور ملاحدہ کے ان اعتراضات کے رَد میں لکھی گئی ہیں، جو انہوں نے سنتِ نبوی پر کئے ہیں، اس کتاب میں امام طحاویؒ نے ان احادیث مشکلہ کی شرح کی ہے، جن میں بظاہر التباس اور خفا ہو، اور یہ اشکال یا تو بظاہر حدیث آخر کے تضاد کی وجہ سے ہوتا ہے یا حقیقت اور نفس الامر میں دکھائی دیتا ہے، اور کبھی کبھار یہ اشکال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ حدیث قرآن، لغت اور عقل یا حِس کے خلاف آجاتی ہے، تو امام طحاویؒ نے یہ اشکال یا تو توفیق بین الحدیثین کی بنیاد پر رفع کیا ہے، یا قرائن کی بنیاد پر ایک کو ناسخ مان کر دوسری کو منسوخ قرار دیا(۱) یا اس اشکال کی تشریح ایسے معنی کے ذریعے کی ہے، جو قرآن، لغت یا عقل کے موافق ہو، یا اُس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں جو موجب اشکال ہو وغیرہ،

امام طحاویؒ نے اس کتاب میں تقریبا ۱۰۰۲ ابواب قائم کئے ہیں اور جمیع نصوص جو اس کتاب میں لائی ہیں وہ تقریبا ۵۴۰۸ ہیں، ہر باب کے نیچے ایک عنوان قائم کر کے اس کے تحت احادیث لائی ہیں، ان کے مسانید اور طرق سے بحث کی ہے، اس کے بعد موضع اختلاف پر کلام کر کے اس کی شرح اور تفصیل ایسی کی ہے کہ دونوں احادیث سے تعارض ختم ہو جاتا ہے، اور متعارض احادیث ہم معنی بن جاتی ہیں، سند میں اتصال وعدم اتصال بیان کرتے ہیں، روایات میں عدم سماع کی علت بیان کر کے آگے پھر اس پر صحت وضعف کا حکم لگاتے ہیں، اور اس صحت وضعف کو امام طحاویؒ مختلف عبارات سے تعبیر کرتے ہیں، مثلاً: هذا الحدیث صحیح الاسناد لا

---

(۱) جیسا کہ شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ نے اس کی مزید تفصیل کی ہے، فرماتے ہیں:

وهذه القرائن هی ما یمکن أن یسمی ب "معرِفات النسخ"، وهي أربعة: أولها: ما یعرف بتصریح رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، کحدیث مسلم: "نهیتکم عن زیارة القبور، فزورها"۔ ثانیها: ما یعرف بقول الصحابی، کحدیث أبی داؤد السجستانی والنسائی وغیرهما عن جابر بن عبد اللّٰه رضی اللّٰه عنهما: کان اخر الأمرین من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ترک الوضوء مما مست النار۔ ثالثها: ما یعرف نسخه بالتاریخ، کحدیث شداد بن أوس: "أفطر الحاجم والمحجوم" وقد یعرف النسخ من القرائن المشیرة الیه، کأن یکون صحابی هذا الحدیث متأخر الاسلام، وصرح بسماعه للحدیث، فیکون ناسخا لحدیث رواه صحابی اخر متقدم الاسلام علی ذاک، وقد سمعه من النبی صلی اللّٰه علیه وسلم حین اسلامه رابعها: ما یعرف نسخه بانعقاد الاجماع علی خلافه (اثر الحدیث: ص: ۱۴۶)

طعن لا حد فی أحد من رواته، حذا حدیث صحیح الاسناد، مستقیم الاسناد، حذا الحدیث عندنا فاسد الاسناد، غیر أن أهل الاسناد یضعفون هذا الاسناد وغیره، اسی طرح کبھی کبھار قیاس پر اعتماد کرتے ہیں، لیکن یہ اس صورت میں کہ جب احادیث میں نص کی وجہ سے کسی ایک جانب ترجیح ممکن نہ ہو، ان ساری باتوں کے باوجود امام طحاویؒ نے اس کتاب میں کسی ایک نوع کی احادیث کا لحاظ نہیں رکھا ہے، بلکہ جو احادیث امام طحاویؒ کو خفیۃ المعنی سامنے آئی ہیں، ان کو ذکر کی ہیں، چاہے وہ عقیدہ کے متعلق ہوں، یا تفسیر، فقہ اور فضائل کے ہوں، بخلاف شرح معانی الاثار کے، کہ اس کو امام طحاویؒ نے ایک محکم ترتیب سے مرتب کی ہے، اسی طرح امام طحاویؒ نے اس کتاب میں کسی خاص مذہب کا التزام نہیں کیا ہے، بلکہ قواعد کی رو سے وہ استنباطات کیے ہیں، جن کی طرف ان کا اجتہاد گیا ہے۔

امام طحاویؒ کی دیگر تصانیف

★ شرح معانی الاثار ★ اختلاف الفقهاء ★ مختصر الطحاوی فی الفقه الحنفی ★ سنن الشافعی ★ العقیدة الطحاویة ★ نقض کتاب المدلسین ★ التسویة بین حدثنا وأخبرنا ★ الشروط الصغیر ★ الشروط الأوسط ★ الشروط الکبیر ★ التاریخ الکبیر ★ أحکام القران ★ النوادر الفقهیة ★ النوادر والحکایات ★ جزء فی حکم أرض مکة ★ جزء فی قسم الفیء والغنائم ★ الرد علی عیسی بن أبان فی کتابه الذی سماه "خطأ الکتب" ★ الرد علی أبی عبید فیما أخطا فیه فی کتاب النسب ★ اختلاف الروایات علی مذهب الکوفیین ★ شرح "الجامع الکبیر" للامام محمد بن الحسن الشیبانی ★ کتاب المحاضرات والسجلات ★ کتاب الوصایا والفرائض ★ أخبار أبی حنیفة وأصحابه ★ کتاب فی النَحل وأحکامها و صفاتها وأجناسها وما روی فیها من خبر ★ جزء الرزیة ★ کتاب الأشربة ★ الخطابات فی الفروع۔

امام طحاویؒ سے قبل اس نوع میں تالیفات

اول اس نوع میں جس نے کتاب لکھی، وہ امام شافعیؒ ہیں، جنہوں نے اختلاف الحدیث نام سے کتاب لکھی، لیکن اس میں پورا استیعاب نہیں کیا بلکہ جملۃ کچھ احادیث فقہ عملی کے ذکر کی ہیں، یہ کتاب کتاب الأم کی ساتویں جلد کے حاشیہ پر چھپی ہے، اور اس کے بعد علیحدہ بھی چھپی ہے۔

دوسری کتاب ابو محمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبۃ نے لکھی ہے، جس کا نام تاویل مختلف الحدیث ہے، اس کی زیادہ تر احادیث عقیدہ اور اس کے فروع کے بارے میں ہیں، لیکن ان دونوں کتابوں کی بنسبت امام طحاویؒ کی کتاب استیعاب اور شمول کے اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے، اسی طرح ازالہ تعارض، متن اور سند حدیث پر نقد کی مہارت اور حدیث کے طرق وألفاظ میں تفنن میں دوسری کتابوں سے الگ ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اس نوع میں کتابیں لکھی ہیں:

☆ مشکل الحدیث وبیانه، لابن فورک: أبی بکر، محمد بن الحسن۔

☆ التحقیق فی اختلاف الحدیث، لابن الجوزی، أبی الفرج، عبد الرحمن ب علی بن محمد البغدادی۔

☆ المعتصر من المختصر من مشکل الاثار، للملطی: أبی المحاسن، یوسف بن موسی۔

☆ تاویل الاحادیث المُوهمة للتشبیه، للسیوطی: جلال الدین عبد الرحمن بن أبی بکر۔

☆ رفع التعارض عن مختلف الحديث، لحسن مظفر الرزو۔

☆ مختلف الحديث بين الفقهاء والمحدثين، لنافذ حسين حماد۔

☆ مختلف الحديث وموقف النقاد والمحدثين منه، لاسامة عبداللہ خیاط۔

''شرح مشکل الاثار'' سے متعلق علماء کی خدمات

اس کتاب کی مزید اہمیت اس سے بھی واضح ہوجاتی ہے کہ بڑے بڑے کبار علماء نے اس پر تحقیقات اور اس کے اختصارات کئے ہیں، جن میں چند درج ذیل ہیں:

☆ محمد بن رشد القرطبي، المالكي کی تصنیف مختصر مشكل الآثار. اس کو ایک خاص ترتیب پر مرتب کی ہے، اس طور پر کہ احادیث کے اسانید اور تکرار کو ختم کیا ہے، اور ساتھ ساتھ الفاظ میں اس طرح اختصار کیا ہے کہ نفس مضمون اور فقہ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا ہے۔

☆ المطهر بن الحسين بن سعد بن علي اليزدي، الحنفي کی تصنیف: تلخيص مشكل الاثار.

☆ علي بن حسام الدين الهندي الشهير بالمتقي کی تصنیف: مجمع بحار الأنوار في شرح مشكل الاثار.

☆ الملطي: القاضي جمال الدين بن يوسف بن موسى بن محمد الفقيه الحنفي کی تصنیف: المعتصر من المختصر من مشكل الاثار.

☆ خالد محمود الرباط کی تصنیف: تحفة الأخيار بترتيب مشكل الاثار اس کتاب میں مصنف نے شرح مشکل الاثار کے ابواب کو ایک خاص ترتیب دی ہے، اور یہ اس لئے کہ امام طحاویؒ نے ابواب مرتب تو کئے ہیں لیکن ابواب (ابواب الطهارة، ابواب الصلاة وغیرہ) الگ جمع نہیں کئے ہیں۔

طبعات

یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں مجلس دائرة المعارف النظامية حیدر آباد دکن سے چار جلدوں میں چھپی تھی، اور اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں مؤسسة الرسالة بیروت سے شعیب الارنؤوط کی تحقیق سے ۱۵ جلدوں میں چھپی ہے۔

مولانا علی عمران
اسلام آباد

یوم پیدائش محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحقیق

یہ تحقیق پروفیسر ظفر احمد صاحب کی ہے اور مجھے یہ مقالہ ان کے بھائی جناب مسعود سہمد صاحب نے بھیجا تھا اور اس کے اندر درج تحقیق کو کسی بھی صورت عام کرنے کی مطلق اجازت دی ہے۔ (علی عمران)

اس دنیا میں جن جن واقعات نے اپنا اثر دکھایا اور دنیا کے ایک بڑے حصے اور پوری بڑی آبادی کو متأثر کیا، مثبت یا منفی طور پر اس کی چلتی آرہی حالت میں بدلاؤ لانے کا ذریعہ بنے، ان تمام واقعات میں سب سے مہتم بالشان، سب سے اہم، سب سے بڑھ کر مؤثر واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس دنیا میں تشریف لانا تھا، یہ دنیا کا اتنا بڑا واقعہ ہے، جس کی مثال شاید تاریخ عالم نہ پہلے پیش کرسکی ہے اور نہ بعد میں، اولاد آدم آفرینش دنیا کے بعد کائنات کے سب سے محیر العقول اور حیرت انگیز واقعہ کا نظارہ تب کررہی تھی، جب سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عالم رنگِ وبو میں تشریف لارہے تھے، یہ تشریف آوری کب اور کس دن ہوئی، کس تاریخ کو ہوئی، ہمارے موجودہ مضمون کا تعلق اسی دن کی صحیح معرفت کیساتھ ہے۔

ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فی زمانہ جو روایت تواتر کے درجے میں مشہور ہوچکی ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ربیع الاول کو ولادت فرما گئے تھے، تاہم تاریخی واقعات اور سنین کے باہمی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بات محض غلط ہے، کچھ ہیئت دان حضرات کی تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ بارہ ربیع الاول کو تو بالکل نہیں ہوئی، تاہم اسی مہینے کی آٹھ اور نو بلکہ چند ایک مزید تواریخ کے بارے ان کے بیان کردہ احتمالات موجود ہیں، تاہم ہماری یہ تحقیق اس مسئلے کے ایک بالکل ہی نئے رخ کو روشناس کررہا ہے، یہ بات نہیں کہ پہلے حضرات علماء نے اس نکتے کو پایا نہیں تھا یا اس کا پہلے کہیں ذکر نہیں پایا جاتا، بلاشبہ اس جہت کا ذکر ضرور موجود ہے اور خاص اس معاملے میں اس کو استعمال بھی کیا گیا ہے مگر بے توجہی یا تساہل کی وجہ سے عموماً اسے بیچ میں ہی ترک کردیا گیا، جس کی وجہ سے مذکورہ جہت کھل کر سامنے نہ آسکی۔

قرآنی اصطلاح نسئی کا مطلب

لیکن اس تحقیق کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک قرآنی اصطلاح یعنی نسئی (یا کبسیہ) کو پہچان لیں، نسی کا عام طور پر مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ عربوں کے ہاں چار مہینے مقدس تھے اور ان مہینوں میں ان کے ہاں لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے تھے، تاہم ہوتا یہ تھا کہ اکثر و بیشتر ان کو لڑنا ہی پڑتا تھا ان مہینوں میں، تو اس کے لیے وہ یہ طریقہ اختیار کرتے تھے کہ مثلاً محرم کے مہینے میں لڑائی

کرنی ہے تو اسے اٹھا کر دوسرے مہینے کو یہاں ایڈجسٹ کر لیتے تھے، یہ خیال ہمارے ہاں تفاسیر وغیرہ سے در آیا ہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ خیال ہی بالکل غیر معقول ہے، مہینہ کوئی مادی شے تو نہیں کہ کوئی بھی عامی اٹھ کر اس کو آگے پیچھے کر دے اور وہ آگے پیچھے ہو جائے۔

بلکہ دراصل یہ سب کچھ ایک میکانزم کے ذریعہ ہوتا تھا، آیئے! اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، عرب قبیلے بنو کنانہ کی یہ ذمہ داری تھی، کہ وہ قمری تقویم کے بعض سالوں میں نسئی کا ایک مہینہ بڑھا کر سال کو تیرہ مہینوں کا کیا کرتا تھا، نسئی کا مہینہ بڑھانے والے کو ناسی کہا جاتا تھا، نسئی کا لغوی معنیٰ ''بڑھانے اور مؤخر کرنے'' کا ہے، متقدمین اہل سیر و مغازی مثلاً ابن ہشام نے ابرہہ کے حملے کے ضمن میں قلامسۃ اور نساۂ کا ذکر بھی کیا ہے (۱/الف) قلامسہ کا لفظ، قلمس اور نساۂ کا لفظ ناسی کی جمع ہے، سب سے پہلے بنو کنانہ کے جس سردار نے نسئی کا مہینہ بڑھایا، اس کا نام حذیفہ بن عبد بن فقیم کنانی اور لقب قلمس تھا، بعد کے ہر ناسی کو قلمس کہا جانے لگا، جس کی جمع قلامسہ آتی ہے۔

قمری اور شمسی تقویم

سب جانتے ہیں کہ خالص قمری تقویم کے مہینے ہمیشہ ایک موسم میں نہیں رہتے، یہ ۳۲ شمسی اور ۳۳ قمری سالوں میں تمام موسموں گرما، سرما، بہار اور خزاں سے ہو کر گزرتے ہیں، اس کے برعکس شمسی سال کے مہینے ہمیشہ اپنے اپنے متعینہ موسم میں ہی رہتے ہیں، اگر قمری مہینوں کو بھی ایک ہی موسم میں رکھنا ہو اور ساتھ ہی مہینے اور تاریخ بھی قمری ہی رکھنی ہو، تو اس کے لیے بعض قمری سالوں کو بارہ کی بجائے لازماً تیرہ کا کرنا پڑے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قمری سال کی دنوں میں مدت شمسی سال کی دنوں میں مدت سے کوئی گیارہ دن کم ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ تین سالوں کے بعد ۳۳ دنوں کا فرق پڑھ جائے گا، اس فرق کو دور کرنے اور قمری مہینوں کو متعینہ موسموں کے مطابق رکھنے کے لیے کوئی تین سال کے بعد اور بعض صورتوں میں دو سال کے بعد قمری مہینے میں نسی کے ذریعے ایک مہینہ بڑھانا ہوتا تھا، عربوں نے دور جاہلیت میں یہ طریقہ اختیار کر کے اپنی خالص قمری تقویم کو بدل ڈالا، کچھ سالوں میں جب یوں تیرھواں مہینہ بڑھایا جائے گا، تو خالص قمری تقویم کے مہینے اپنی جگہ پر نہیں رہیں گے۔

ہماری موجودہ ہجری تقویم خالص قمری ہے، فرض کیجئے! کسی سال اس کے مہینوں ربیع الاول اور ربیع الثانی کے درمیان ایک اور مہینہ ربیع الاول نسئی کے نام سے بڑھایا جاتا ہے، تو ربیع الاول سے بعد والے مہینے اپنی جگہ پر نہیں رہیں گے، بلکہ ایک ماہ کے لیے مؤخر ہو جائیں گے، اسی عمل کو جاری رکھتے ہوئے جب اگلے تین سالوں میں ایک سال کو پھر تیرہ مہینوں کا کیا جائے گا، تو قمری مہینے اپنے اصل مقام سے مزید مؤخر ہو جائیں گے، اس عمل کے جاری رکھنے پر مہینوں کے مؤخر ہوتے رہنے کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا، یہاں تک کہ ۳۳ سالوں کے بعد جا کر ربیع الاول کا اصل مہینہ اپنی حقیقی جگہ پر آ جائے گا، اور وہ بھی صرف دو تین سالوں کے لیے اصل مقام پر رہے گا، اس کے بعد نسئی کے عمل کو جاری رکھنے پر سالہا سال کے لیے اپنی جگہ پر نہیں رہے گا، بلکہ اس کی جگہ پر دوسرے قمری مہینے ادل بدل کر آتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگلے ۳۳ سالوں کے بعد ربیع الاول اپنی اصل جگہ پر آ جائے گا۔

بعض قمری سالوں میں نسئی کے ذریعے اگر تیرھویں مہینے کو بڑھا کر انہیں خاص موسموں میں اس طرح متعین کر دیا جائے،

جیسے شمسی تقویم کے مہینے ہوا کرتے ہیں، تو اس طرح نمودار ہونے والی قمری تقویم اپنی اصلی حالت پر رہنے کے بجائے قمریہ شمسی (Luni-Solar) تقویم بن جائے گی، نسئی کے تیرھویں مہینے کا اصطلاحی نام ''کبسیہ'' ہے اور تیرہ مہینے والے سال کو ''مکبوس سال'' کہا جاتا ہے، اوراس کے مقابلے میں بارہ مہینوں والے سال کو اس قمریہ شمسی تقویم میں غیر مکبوس سال کہا جاتا ہے۔

مکبوس اور غیر مکبوس سال

مکبوس اور غیر مکبوس سالوں پر مشتمل اس قمریہ شمسی تقویم کو ''نسئی والی تقویم'' اوراس کے مہینوں کو نسئی کے تقویم والے مہینے کہا جاتا ہے، عربوں نے جب اس تقویم کو اپنایا، تو بعض قمری سالوں میں تیرھواں مہینہ بڑھانے کی ذمہ داری قبیلہ بنوکنانہ کے سپرد کی گئی، اس قبیلے کا سردار ایام حج میں مخصوص سالوں میں تیرھواں مہینہ بڑھانے کا باقاعدہ اعلان کیا کرتا تھا، چوں کہ قمریہ شمسی تقویم کی حفاظت بنوکنانہ کے سپرد تھی اور چونکہ قمریہ شمسی تقویم کی وجہ سے دور جاہلیت کا حج خالص قمری تقویم کے ذی الحجہ کی بجائے قمریہ شمسی ذی الحجہ میں ہوا کرتا تھا، لہٰذا جس ذی الحجہ میں ابرہہ والئ یمن کو پورا وثوق اور اطمینان تھا کہ عرب اس کے بنائے ہوئے کلیسا کا حج کریں گے، تو یہ ذی الحجہ قمریہ ہرگز نہیں تھا، بلکہ قمریہ شمسی ذی الحج تھا، قمریہ شمسی تقویم اور قمریہ شمسی ذی الحج کی حفاظت کی ذمہ داری بنوکنانہ پر تھی، سو ہوا یوں کہ بنوکنانہ کے ایک آدمی نے جاکر اس کے بنائے کلیسا کی بے حرمتی کردی، جس پر ابرہہ طیش میں آیا اور لشکر لے کر (العیاذ باللہ) کعبہ کو ڈھانے چلا۔

نسئی رسم کی ضرورت کیوں؟

آخر نسئی کیوں؟ یہاں پر یہ سنجیدہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر عربوں کو یہ نسئی کی رسم لانے کی ضرورت ہی کیا تھی، جس کی وجہ سے ان کی ساری تاریخ ہی درہم برہم نظر آتی ہے؟ اس کا جواب امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''قمری سال شمسی سال سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے قمری مہینے ایک موسم سے دوسرے موسم میں آتے جاتے رہتے ہیں، حج کبھی سرما میں ہوتا ہے، تو کبھی (ایک خاص عرصے بعد) موسم گرما میں ہوتا ہے، اس سے دور جاہلیت کے عربوں کے اشہر حج میں ان کے تجارتی مفادات میں خلل پذیر ہونے لگی، تو انہوں نے یہودیوں سے کبسیہ (نسئی کا مہینہ ڈالنے) کا طریقہ سیکھا، اس سے وہ بعض قمری سالوں کو تیرہ مہینے کا کرنے لگے، جس سے اصل ذی الحجہ یعنی قمری تقویم کا ذی الحجہ اپنی جگہ سے بدل کر دوسرے مہینوں میں آنے لگا (۱/ج) اسی طرح کا مضمون تفسیر ثعالبی میں بھی ہے، اس بات کا اظہار حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے بھی کیا ہے، طبرانی کی المعجم الاوسط میں ان کی روایت کے الفاظ یوں ہے کانت العرب یحلون عاماً شھراً وعاماً شھرین ولا یصیبون الحج الافی کل ست وعشرین سنة مرة (۲/ج) یعنی عرب ایک سال (حرمت والے) مہینے کو اس کی جگہ دوسرا مہینہ لاکر حلال ٹھہراتے تھے تو دوسرے سال دو مہینوں کو حلال ٹھہراتے تھے اور حج (کے صحیح مہینے ذی الحجہ قمریہ) کو چھبیس سالوں میں صرف ایک مرتبہ پاتے تھے۔

رسم نسئی اہل سیر و مغازی کی روشنی میں

اہل سیر و مغازی نے بھی دور جاہلیت کی رسم نسئی کی وضاحت میں لکھا ہے کہ نسئی کی وجہ سے عربوں کا اصل حج قمری ذی

الحجہ میں نہیں ہوتا تھا(کیونکہ قمریہ شمسی ذی الحجہ اور قمری ذی الحجہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے) چنانچہ مشہور سیرت نگار علامہ سہیلی رحمہ اللہ اپنی کتاب الروض الانف میں لکھتے ہیں، فکانوا یؤخرونہ کل عام احد عشر یوماً او اکثر قلیلا حتی یدور إلی ثلث وثلثین سنة فیعود إلی وقته (۳/ب) وہ اہل عرب اس (ذی الحجہ) کو ہر سال گیارہ دن یا اس سے بعض اوقات زائد ایام تک مؤخر کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ یونہی ۳۳ (قمری) سالوں تک چلتا رہتا، اور پھر وہ (ذی الحجہ ۳۳ سالوں بعد) اپنے اصل وقت پر لوٹ آیا کرتا تھا۔

اسی طرح البیرونی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاثار الباقیة میں لکھا ہے کہ ''عرب کے بت پرست ابتدا میں خالص قمری تقویم پر عمل پیرا تھے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ حج کے مہینے مختلف موسموں سے گذرتے ہیں جس سے ان کے تجارتی اور معاشی مفادات سخت مجروح ہوتے یں (ذی قعدہ کے مہینے میں عکاظ اور ذوالمجاز کے تجارتی میلوں میں) موسم کے مطابق کھجوروں اور بھیڑ بکریوں وغیرہ کی تجارت خلل پذیر ہوتی ہے تو انہوں نے حج کے ان قمری مہینوں کو ایک خاص موسم (موسم گرما) میں متعین کرنے کے لیے یہودیوں سے کبیسہ کا طریقہ سیکھا (اسی کو نسئی کا مہینہ یا بالفاظ دیگر لیپ کا مہینہ کہا جاتا ہے) البیرونی کے نزدیک دوسو سال قبل ہجرت یہ معاملہ چل پڑا تھا۔

عرب میں تقویموں کے اختلاف کے اثرات

عرب میں ان دو تقویموں کی وجہ سے جو گڑبڑ پھیلی کہ مؤرخین سالوں کے حوالوں میں بہت زیادہ اختلاف کر جاتے ہیں، یہاں تک کہ سالوں تک کا اختلاف نقل کرتے ہیں، عقلاً یہ فرق کسی طور عام نہیں بلکہ خاص ہے، اس تحقیق کو سامنے رکھا جائے تو اس لائن کے بھی بہت سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔

اس بات کا اقرار مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب ''تقویم تاریخی'' (۶/ب) میں، محترم ضیاء الدین لاہوری نے جوہر تقویم (۶/ج) اور محترم اسحاق النبی علوی صاحب نے توقیت السیرة النبویة میں کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دور نبوی میں قمریہ شمسی اور قمری دونوں تقاویم چل رہی تھیں، قمریہ شمسی محرم کا آغاز موسم خزاں سے ہوا کرتا تھا، غزوہ بدر اور فتح مکہ کا رمضان قمریہ شمسی تھا، چونکہ غزوہ بدر اور فتح مکہ کے رمضان میں سخت گرمی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احباب نے پہلے روزہ رکھا ہوا تھا اور بعد میں جنگ کی وجہ سے روزہ افطار کیا، تو اس سے یقینی ثبوت اس امر کا بھی فراہم ہوا کہ حجۃ الوداع میں قمریہ شمسی تقویم کی منسوخی سے پہلے بھی اس دور کے معاشرتی حالات اور دیگر ناگزیر وجوہ کی بناء پر اسی قمریہ شمسی تقویم پر عمل پیرا تھے۔

اہل مغرب نے بھی اس بات کو مانا ہے، ''کولیرز انسائیکلوپیڈیا'' میں باقاعدہ اس کا ذکر ہے (۷/ب) انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں یہودی تقویم کے ضمن میں لکھا ہے کہ یہودیوں کا وہ مذہبی پیشوا، جو بعض سالوں میں تیرھویں مہینے کا اضافہ کیا کرتا تھا، اسے ناسی کہا جاتا تھا (۷/ج)

باہمی تغلیط کی ایک مثال ہم پیش کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم یکم ذی قعدہ چھ ہجری کو بروز سوموار اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ منورہ سے بعض بغرض عمرہ مکہ مکرمہ کے لیے عازم سفر ہوئے، اس عمرے کے ضمن میں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ قریش مکہ سے جنگ

کے ہرگز خواہاں نہیں تھے، بلکہ آپ صرف عمرہ کرنا چاہتے تھے، ادھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے پتہ چلتا ہے، کہ قریش مکہ اور دیگر قبائل عرب حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو نہایت ہی سنگین گناہ سمجھتے تھے، (۱۸/الف) اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ (معاذ اللہ) قریش مکہ کو خواہ مخواہ اور ناحق مشتعل کرنا چاہتے تھے۔

اصل حقیقت

یہاں اصل حقیقت تک رسائی کے لیے ہمیں خالص قمری تقویم کی یکم ذی قعدہ چھ، ہجری قمری کے بالمقابل عیسوی تاریخ دیکھنی چاہیے، چنانچہ یکم ذی قعدہ چھ، ہجری کے مقابل عیسوی تاریخ تیرہ مارچ ۶۲۸ عیسوی جپولین اور دن اتوار تھا، مدینہ منورہ میں چاند ایک دن کی تاخیر سے نظر آیا، لہٰذا یکم ذی قعدہ چھ، ہجری قمری کو سوموار کا دن تھا اور عیسوی تاریخ چودہ مارچ ۶۲۸ عیسوی جپولین تھی.

اگر عیسوی تاریخ کو عربوں کی قمریہ شمسی تقویم کے محرم کے مقابل رکھا جائے، تو مارچ کا مہینہ رجب قمریہ شمسی کے مقابل ہوتا ہے، اور اسی رجب قمریہ شمسی کو دور جاہلیت میں عربوں نے عمرے کے لیے مخصوص رکھا تھا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ قریش مکہ کی تقویم قمریہ شمسی تھی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا عمرے کے لیے یہ سفر اس دور کے معاشرتی حالات سے پوری طرح ہم آہنگ تھا، پس عمرے کے لئے روانگی کی تاریخ یکم رجب ۶ ہجری قمریہ شمسی مطابق یکم ذی قعدہ چھ، ہجری قمری مطابق ۱۴ مارچ ۶۲۸ عیسوی جپولین اور دن سوموار تھا، اہل سیر نے اس عمرے کے سفر کی توقیت خالص قمری تقویم میں کی ہے.

حضور ﷺ کا ورود مسعود کس تاریخ کو ہوا؟

اس تمہید کے بعد اب آتے ہیں اپنے موضوع کی طرف، یعنی حضور ﷺ کا ورود بامسعود کس تاریخ کو ہوا تھا؟ آگے کی بات مختصراً یہ ہے مشہور ترین قول کے مطابق حضور ﷺ کی عمر مبارک ۶۳ سال ہے، چونکہ دور نبوی میں حجۃ الوداع تک قمریہ شمسی تقویم غالب رہی اور خالص قمری تقویم مغلوب رہی اور چونکہ نہایت ہی معمولی فرق کے ساتھ قمریہ شمسی سال کی دنوں میں مدت شمسی سال کے برابر ہوتی ہے اور چونکہ عیسوی تقویم شمسی تقویم ہے اور چونکہ عیسوی تقویم میں آپ کا سال وفات بالاتفاق ۶۳۲ جپولین ہے، لہٰذا عیسوی تقویم میں آپ کا سال ولادت ۶۳۲-۶۳ = ۵۶۹ عیسوی جپولین ہوا.

اس کو تفصیل سے ذرا یوں سمجھ لیجئے کہ دور جاہلیت اور دور نبوی کے عربوں کی قمریہ شمسی تقویم کے مہینے محرم کی پہلی تاریخ عیسوی تقویم کی ۱۷ اگست سے ۲۶ ستمبر کی تواریخ کے درمیان ہوا کرتی تھی، یعنی محرم قمریہ شمسی کا بڑا حصہ اکثر و بیشتر سالوں میں عیسوی ستمبر کے مقابل ہوا کرتا تھا، پس صفر قمریہ شمسی کا بڑا حصہ عیسوی اکتوبر اور ربیع الاول قمریہ شمسی کا بڑا حصہ عیسوی نومبر کے مقابل ہوا کرتا تھا.

دور جاہلیت کے عربوں کا حج ہمیشہ نسئی پر مبنی قمریہ شمسی تقویم کے ذی الحجہ میں ہوا کرتا تھا، اور بقول البیرونی کوئی دو سو قبل ہجرت یعنی ہجرت سے دو سو سال پہلے سے یہ سلسلہ چلا آرہا تھا، نسئی پر مبنی یہ ذی الحج اصل قمری ذی الحجہ کے مقابل لگ بھگ ۳۳ سال کے بعد جا کر ہوا کرتا تھا، ورنہ اکثر و بیشتر سالوں میں اس کے مقابل خالص قمری تقویم کے دوسرے مہینے ادل بدل کر آتے رہتے تھے، ابرہہ نے جس ذی الحجہ کے گذرنے پر محرم میں مکہ مکرمہ پر لشکر کشی کی، وہ قمریہ شمسی ذی الحجہ تھا، اور محرم تھے، سو اس حملے کے

پچاس دن بعد جس ربیع الاول میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی، تو لامحالہ یہ ربیع الاول بھی قمریہ شمسی تقویم کا ہی تھا، چونکہ عیسوی تقویم میں آپ کا سال ولادت ۵۶۹ عیسوی جیولین ہے اور چونکہ ربیع الاول قمریہ شمسی عیسوی نومبر کے مقابل ہوا کرتا تھا، لہٰذا عیسوی سال ۵۶۹ کے نومبر کے بالمقابل عربوں کا قمریہ شمسی ربیع الاول ہوا، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نومبر ۵۶۹ عیسوی میں خالص قمری مہینہ کون سا ہوسکتا ہے؟ وہی قمری مہینہ قمریہ شمسی ربیع الاول کے مقابل ٹھہرے گا، آپ تقویم پر کسی بھی معتبر کتاب مثلاً محترم ضیاء الدین لاہوری کی جوہر تقویم کی طرف مراجعت فرما سکتے ہیں، جوہر تقویم میں یکم نومبر ۵۶۹ عیسوی کے مقابل خالص قمری تقویم کی تاریخ ۵ رمضان المبارک ۵۵ قبل ہجرت اور دن جمعہ لکھا ہے، بس ۴ نومبر ۵۶۹ عیسوی کو خالص قمری تقویم کی تاریخ ۸ رمضان المبارک ۵۵ قبل ہجرت اور دن ٹھیک سوموار ہوا، مذکورہ بالا وضاحت کے مطابق اس کے مقابل قمریہ شمسی تاریخ ۸ ربیع الاول ۵۳ قبل ہجرت قمریہ شمسی ہوئی، قمریہ شمسی سال اور اسی طرح شمسی سال کی دنوں میں مدت خالص قمری سال کی دنوں میں مدت سے کوئی گیارہ دن زائد ہوتی ہے، اس لیے ۵۵ قمری سالوں کے قمریہ شمسی اور شمسی سال ۵۳ ہوتے ہیں، یکم محرم ۱ ہجری قمری کو عیسوی تاریخ ۱۴ جولائی ۶۲۲ عیسوی جیولین اور دن جمعہ تھا، یعنی ہجری تقویم کے آغاز سے پہلے ۶۲۱ عیسوی سال گذر چکے تھے، لہٰذا قبل ہجرت سالوں سے ۶۲۲ سال اور بعد ہجرت سالوں سے ۶۲۱ سال منہا کیے جائیں تو قمریہ شمسی، ہجری سال برآمد ہوگا، چنانچہ ۵۶۹ عیسوی جیولین میں قمریہ شمسی ، ہجری سال ۵۶۹-۶۲۲ = ۵۳ سال قبل ہجرت قمریہ شمسی ہوا، یوں رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ کی تاریخ ۸ ربیع الاول ۵۳ قبل ہجرت قمریہ شمسیہ مطابق ۸ رمضان المبارک ۵۵ قبل ہجرت قمری تاریخ مطابق ۴ نومبر ۵۶۹ عیسوی بروز سوموار کی ہوئی.

اب اگر کوئی صاحب یہ دعویٰ کرے کہ ولادت مبارکہ کا عیسوی سال ۵۶۹ نہیں بلکہ ۵۷۰ یا ۵۷۱ عیسوی ہے، تو بھی انہیں کوئی مفاد حاصل نہ ہوگا، جوہر تقویم میں یکم نومبر ۵۷۰ عیسوی کے مقابل تاریخ ۲۶ رمضان المبارک ۵۴ قبل ہجرت قمری اور یکم نومبر ۵۷۱ عیسوی جیولین کے مقابل تاریخ رمضان المبارک ۵۳ قبل ہجرت قمری ملے گی، یعنی کسی بھی صورت میں رمضان المبارک سے پیچھا نہیں چھڑایا جاسکتا، یہ صرف اسی صورت ممکن ہے کہ سال ولادت کو عیسوی تقویم میں ۵۷۱ عیسوی قرار دیا جائے اور ولادت مبارکہ مہینے ربیع الاول کو محض تحکم سے خالص قمری تقویم کا سمجھا جائے، مگر کوئی سلیم الطبع اور انصاف پسند شخص اس تحکم کو قبول نہیں کرسکتا.

خودساختہ قمری شمسی تقویم

مختصراً عرض یہ کہ حضور ﷺ کی ولادت مبارکہ کا ربیع الاول ہرگز خالص قمری تقویم کا صحیح اور خالص ربیع الاول نہیں تھا، بلکہ دور جاہلیت کے عربوں کی من گھڑت، خودساختہ جعلی قمریہ شمسی تقویم کا جعلی اور من گھڑت ربیع الاول تھا، خالص قمری مہینہ رمضان المبارک کا تھا، پھر جب نسئ کی یہ رسم بالاتفاق حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے بحکم الٰہی منسوخ فرمادی اور خالص قمری تقویم ہی محسوب ہونے لگی، تو آپ ﷺ کی وفات کا ربیع الاول یقیناً خالص قمری تقویم کا ربیع الاول تھا، یعنی وہی ربیع الاول، جو ہماری خالص قمری ہجری تقویم میں ہر سال آیا کرتا ہے، اور اجتماع شمس وقمر (ولادت قمر) کی تاریخ اور وقت کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ آپ ﷺ کی اس دار فانی سے عالم بقاء کی طرف رحلت تاریخ مدنی رؤیت ہلال کے اعتبار سے ٹھیک ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری قمری بروز سوموار ہے.

المختصر ہمارا کہنا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خالص قمری ربیع الاول کے آٹھ تاریخ کو نہیں بلکہ قمریہ شمسی تقویم کے ربیع الاول کے ۸ تاریخ کو پیدا ہوئے تھے اور خالص قمری تقویم میں یہ دن ۸ رمضان کا بنتا ہے، ابن کثیرؒ، حمیدی، ابن حزم، حافظ کبیر محمد بن موسیٰ الخوارزمی، ابوالخطاب بن دحیہ نے اس کو ترجیح دی ہے (۳۱/ب)

ابن حبیب بغدادی نے بھی تاریخ ولادت ۸ ربیع الاول ہی قرار دی ہے، اور لکھا ہے کہ سال ولادت میں یکم محرم کو جمعہ کا دن تھا، ابرہہ کا حملہ ۱۷ محرم کو ہوا تھا، اور اس کے پچاس روز بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی (۳۱/ج)

بقول ابن کثیر مشہور ترین قول کے مطابق آپ کی ولادت مبارکہ عام الفیل میں ابرہہ کے حملے کے پچاس دن بعد ہوئی تھی (۳۲/الف) شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں ''اور آٹھ ربیع الاول کا قول بھی ہے شیخ قطب الدین عسقلانیؒ کے بقول اکثر محدثین نے اسی قول کو اختیار کیا ہے یہی قول ابن عباس اور جبیر بن مطعم کا سے منقول ہے، اور اسے ان لوگوں نے اختیار کیا ہے، جنہیں اس طرح کے امور کی معرفت حاصل ہے، اسی قول کو حمیری اور ان کے شیخ ابن حزم نے اختیار کیا ہے، اور قاضی نے عیون المعارف میں اس قول پر اہل شہر کا اجماع نقل کیا ہے، اور اسی کی روایت زہری نے محمد بن جبیر بن مطعم سے کی ہے، جو نسب اور ایام عرب کے ماہر تھے'' (۳۲/ب)

مصادر و مراجع

(۱/الف) سیرۃ ابن ہشام، ج ۱ ص ۴۴، ۴۶

(۱/ج) تفسیر کبیر امام رازی ۱۶/۴۹

(۲/ج) جمع الفوائد، ج ۲، ص ۱۷۳، ح رقم ۶۹۹

(۳/ب) علامہ سہیلی الروض الانف ج ۱، ص ۶۱

(۶/ب) مولانا عبدالقدوس ہاشمی/تقویم تاریخی، طبع دوم، تمہیدی صفحات

(۶/ج) ضیاء الدین لاہوری، جوہر تقویم صفحات ۲۵۷، ۲۵۹

(۷/ب) کولیز انسائیکلو پیڈیا ص ۱۳۹، زیر عنوان مسلم کیلنڈر

(۷/ج) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۱۰ ص ۲۱۸

(۱۸/الف) جمع الفوائد ج ۱، ح رقم ۳۴۴۹

(۳۱/ب) البدایۃ والنہایۃ ج ۲، ص ۲۶۵

(۳۱/ج) ابن حبیب المحبر ص ۱۱۲

(۳۲/الف) البدایۃ والنہایۃ ج ۲، ص ۲۶۷

(۳۲/ب) شیخ عبدالحق محدث دہلوی ماثبت بالسنۃ فی اعمال السنۃ (عربی) ص ۲۸۸

مولانا سید حبیب اللہ حقانی
مدرس جامعہ عثمانیہ ملاوی افریقہ

ادائیگی حقوق کی فکر کیجیے

دورِ حاضر کا المیہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا ہے ہر ایک کہتا ہے کہ مجھے اپنا حق ملے، اگر چہ اس نے بہت سارے لوگوں کے حقوق دبائے ہوئے ہوں، لہٰذا اپنے حقوق کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کے حقوق ادا کئے جائیں اگر زندگی حقوق سے باہر نکل جائے تو سرکش و باغی ہو جاتے ہیں، اس کی تمام قدریں پامال ہو کر رہ جاتی ہیں اس کا تمام جمال ختم ہو جاتا ہے اگر زندگی حقوق سے محروم ہو جائے تو ایک بے بس محکوم شے بن کے رہ جاتی ہے۔

انسان پر اپنی زندگی میں کئی حقوق کی ادائیگی واجب ہو جاتی ہیں، ان تمام حقوق کی تفصیل کا ''الصدیق'' کے صفحات متحمل نہیں مگر پھر بھی اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہے، ویسے تو حقوق کی بہت ساری قسمیں ہیں لیکن ابتداً بنیادی طور پر دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد، حقوق ''حق'' کی جمع ہے اور عربی میں حق کا خاصہ ثبوت و قیام ولزوم ہے یعنی جو چیز اٹل ہو، اور اس کا ہونا لازم اور ضروری ہو حقّاً عَلَى الْمُتَّقِيْن یہ حکم لازم ہے پرہیز گاروں پر، جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز فلاں کا حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز فلاں کے لئے ثابت ہے اور اس کا دینا لازم وضروری ہے، مطلب یہ کہ حقوق وہ امور اور ذمہ داریاں ہیں جن کی ادائیگی اور پورا کرنا ضروری اور لازم ہے۔

حقوق میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ ضروری حقوق، حقوق اللہ ہیں اس لئے کہ وہی ہم سب کا خالق مالک، پرورش کرنے والا، رزق دینے والا، عزت دینے والا، سب کے کام بنانے والا اور ہر چیز کا مالک ہے، زندگی دینے والی ذات چاہتی ہے کہ انسان اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے اصل میں حقوق العباد بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عائد کردہ حقوق ہیں تو اس کی ادائیگی بھی گویا اللہ کے حق کی ادائیگی ہے، اللہ تعالیٰ کے چند بڑے حقوق یہ ہیں :

- ☆ اللہ تعالیٰ کو اپنے ذات وصفات، اختیارات اور اس کی عبادت میں ایک اور یکتا مانا جائے اور اسی کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔
- ☆ اللہ کی رضا ومحبت کو ہر مخلوق پر مقدم رکھنا، اللہ کے ساتھ محبت رکھنا اور اسی کے لئے رضا کا طالب رہنا۔
- ☆ اللہ تعالیٰ کے لئے محبت رکھنا اور اسی کے لئے بغض رکھنا اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا۔
- ☆ انتہائی محبت وتعظیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا اور اس کی اطاعت کو ہر چیز پر مقدم رکھنا، یعنی لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق مخلوق کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرنا بلکہ جہاں بھی اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کا حکم اور بات متصادم ہو جائے تو مخلوق کے حکم اور بات کو حقیر اور باطل جان کر چھوڑنا اور اللہ تعالیٰ کی بات اور اس کے حکم کو اختیار کرنا۔

حقوق العباد میں سب سے زیادہ اہم حق والدین کا ہے، جس کے بارے میں اسلامی تعلیمات بہت واضح ہے، یہاں چونکہ پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں عرض کرنا مقصود ہے، تو اختصار کے ساتھ چند احادیث ملاحظہ فرمائیں، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوسکے گا جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو، اسی طرح طبرانی کی روایت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ شخص (کامل) مومن نہیں ہوسکتا جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ! مجھے کیسے معلوم ہو کہ میرے معاملات اچھے ہیں یا برے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم اپنے پڑوسیوں کو یہ کہتے ہوئے سنو کہ تمہارے معاملات اچھے ہیں اور جب اپنے پڑوسیوں کو یہ کہتے ہوئے سنو کہ تمہارے معاملات برے ہیں تو یقیناً تمہارے معاملات برے ہیں۔

حضرت عبدالرحمن بن ابی قرادؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن وضو فرمایا تو آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ وضو کا پانی لے کر (اپنے چہروں اور جسموں) پر ملنے لگے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کون سی چیز تمہیں اس کام پر آمادہ کر رہی ہے؟ انہوں عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس سے محبت کرے یا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ اس سے محبت کرے تو سچ بولے، جب کوئی امانت رکھوائی جائے تو اس کو ادا کرے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرے، (مشکوٰۃ) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جبرائیلؑ مجھے پڑوسی کے حق کے بارے میں اس قدر وصیت کرتے رہے کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ پڑوسی کو وارث بنادیں گے، (بخاری) حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن (جھگڑنے والوں میں) سب سے پہلے دو جھگڑنے والے پڑوسی پیش ہوں گے (مسند احمد) یعنی بندوں کے حقوق میں سے سب سے پہلا معاملہ دو پڑوسیوں کا پیش ہوگا۔

ہم ان روایات کو ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ پڑوسی کے بارے میں ہمیں کیا ہدایات دی گئیں ہیں؟ اور ہمارا کردار اس بارے میں کیا ہے؟ یقین جانیں اس مغربی طرزِ معاشرت اور شہری زندگی میں سالوں سال پڑوسی کا کوئی نہیں پوچھتا، ساتھ ہی گھر ہوگا اس کے پڑوسی کے بارے میں پوچھو تو کہے گا کہ میں نہیں جانتا، حالانکہ ہمیں حکم ہیں کہ سالن میں ذرا پانی زیادہ ڈالیں تاکہ پڑوسی کو بھی کچھ دو، اب جدید مصنوعات ریفریجریٹر وغیرہ نے بھی ہمیں کنجوس اور بخیل بنایا، بجائے اس کے کہ پڑوسی کو کچھ دیا جائے فریج میں رکھ کر ہفتوں کھاتے ہیں یا خراب ہوکر کچرا میں پھینکتے ہیں لیکن پڑوسی کو دینے سے پرہیز؟ آخر یہ کیوں ہو رہا ہے، ہم نے اپنے تہذیب وتمدن کو کیوں چھوڑا ہے؟ ہمارا مذہب تو ہمیں پڑوسی سے اچھے سلوک کا حکم دیتا ہے، مگر ہم ہیں کہ پڑوسی کے تنگ کرنے میں مزا محسوس کرتے ہیں، اس کے بچوں کو ستانے کے لئے اپنے بچوں کے لئے قیمتی کھلونے لاتے ہیں جس کے خریدنے کی اس بیچارے میں طاقت نہیں ہوتی اس کے بچے روتے ہیں، زمین پر لوٹتے پوٹتے ہیں اور لڑھکتے پڑتے ہیں وہ بے چارہ بچوں کو دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے کہ ربّا! ان کے کھانے پینے، رہنے سہنے، گیس بل، بجلی بل، ڈاکٹر بل، سکول بلوں غیرہ کے لئے کماؤں، قرض ادا کروں یا ان معصوم بچوں

کوکھلونے لاکردوں، آخر ہمارے دلوں سے صلہ رحمی، باہمی ہمدردی، دردمندی اورغم خواری کیوں نکل گئیں؟ اس کے وجوہات کیا ہیں؟ ہمیں ان وجوہات پرسوچنا چاہیےاوراس کے روکنے کی تدابیر کرنی چاہیے؟ یہ جدید انسان اتنا خودغرض کیوں ہوا؟ اس کے دل میں محبت ،شفقت اوررحم کے جذبات کیوں نہیں رہے آخر یہ سنگ دلی اور بے رحمی کیوں پیدا ہوئی ؟

آپ کہیں گے کہ لوگ موجودہ ملکی اور بین الاقوامی حالات، عدلیہ اورحکومت کے باہم مشت وگریباں ہونے پر لکھتے ہیں اور تم پڑوسی کے حقوق اورتمام حقوق کے ادائیگی کے پیچھے پڑے ہوتو احقر دست بستہ عرض کرے گا کہ ملکی اور بین الاقوامی حالات پر لکھنے والوں کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں ہیں لیکن ان لوگوں کے ہدایات سے ہم لوگوں نے کہاں تک سبق حاصل کیا ؟ اسی طرح حقوق ومعاشرت پرلکھا جاتا ہے اورلکھا جائے گا ان شاءاللہ مگر یہاں بھی یہی سوال ہوگا کہ خود ہمارا عمل کرنے کا تناسب کیا ہے؟! ناراض نہ ہوں، احقر خودکوان تمام باتوں کا محتاج سمجھتا ہے، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں پڑوسیوں کے حقوق کے ادا کرنے والے اورتمام حقوق جو ہمارے ذمہ ہے کہ ادا کرنے والے بتائیں، جب ہم دوسروں کے حقوق ادا کریں گےتو دوسرے لوگ ہمارے حقوق خودبخود ادا کرنا شروع کریں گے یہ اپنے حقوق لینے کے لئے جو جھگڑے ہیں سب ختم ہوجائیں گے۔

مولانا محمد اسلام حقانی
مؤتمر المصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

بے سہاروں کی مدد
قرآن کی روشنی میں تزکیہ نفس کا بہترین طریقہ

حقوق العباد یا خدمت خلق کی قرآن واحادیث میں جس قدر تاکید کی گئی ہے ان سب سے ہم لوگ اچھی طرح واقف ہیں، اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے اور سب سے بہتر عمل مومن کو خوشی پہنچانا، اسے بے لباسی کی حالت میں کپڑے پہنانا یا بھوک کی حالت میں کھانے سے آسودہ کرنا یا اس کی ضرورت پوری کرنا، لیکن اسلامی تعلیمات کے سننے اور سمجھنے کے باوجود آخر مسلمانوں میں خدمت خلق کا جذبہ کیوں سرد ہے؟ آج عالم اسلام کے لاکھوں افراد بھوک اور افلاس کی وجہ سے پریشان حال اور دانہ دانہ کے محتاج ہیں مگر مسلمانوں میں ان کے مدد اور تعاون کیلئے جس قدر اس کا چرچا ہونا چاہئے تھا اس کی کوئی جھلک اور علامت نظر نہیں آرہی ہے، شاید یہی آج ہماری ذلت ورسوائی کا سبب ہو، ذیل کے مضمون میں کچھ اس طرف روشنی ڈالی گئی ہے۔

صنعتی ترقی اور نو بہ نو اور کثرت ایجادات کے زیر اثر جدید معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اس معاشرے میں بولے جانے والے الفاظ اپنی حقیقی روح کھو چکے ہیں، انسانوں کے فکر ونظر کا محور قرآن کے لفظوں میں دنیا سے بے پناہ محبت بن گیا ہے اس دور کے انسان کی تقدیر معاشی اور اقتصادی اصطلاحوں کے ذریعے لکھی جارہی ہے اور انسان کی شناخت کا پیمانہ اس کے مادی اسباب اور وسائل کو بنالیا گیا ہے، یہ صورت حال اگر مغربی دنیا تک محدود ہوتی تو شاید کوئی اہم بات نہ ہوتی مگر مشرق اور خصوصا عالم اسلام علوم وفنون (صنعت وحرفت) کے میدان میں مغرب سے بہت پیچھے رہ جانے کے باوجود مادہ پرستی کے معاملہ میں مغرب کے برابر ہی نہیں، اس سے کچھ آگے ہی ہیں، قصے کہانیوں اور خوبصورت روایات میں الجھ جانے کے باعث ان کا رشتہ الکتاب سے ختم ہوگیا، لہٰذا اس دور میں دین داری کے معنی بدل گئے اور مرد مؤمن کی اصطلاح اپنی نورانی کشش سے محروم ہوگئی، اب حق، صداقت، ایمان، انفاق فی سبیل اللہ، مجاہدہ، خدمت خلق اور حقوق العباد جیسے سارے الفاظ بے روح ہو چکے ہیں، لہٰذا دین ایک عظیم الشان، علمی، عملی، ثقافتی اور روحانی تجربے کے بجائے ایک ایسا کام نظر آتا ہے جو نہایت قابل قدر ہونے کے باوجود قابل عمل نہیں ہے، اس رجحان کو تقویت دینے میں بنیادی کردار تعقل غالب سے مرغوبیت کا ہے جس سے نہ صرف عوام الناس مغلوب ہوئیں بلکہ دیندار طبقہ بھی اس تعقل غالب سے مرغوب ومغلوب ہوکر اپنے اہداف سے روگردانی کا شکار ہوئے، جنہوں نے کہیں سادگی، کہیں لاعلمی، کہیں عدم آگاہی، کہیں عصبیت،

کہیں ذاتی مفادات اور کہیں دیگر ترجیحات کے باعث دین کی بنیادی تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کرانے کا طریقہ بدل دیا حتی کہ بعض تنظیمیں، جماعتیں اور تحریکیں اردگرد اڑنے والے غبار میں گم ہوگئیں اور اصل دعوت پہنچانے کے بجائے عارضی، وقتی، ہنگامی اور سیاسی معاملات ان کے سارے خیر پر اس طرح غالب آ گئے کہ ان کا وجود اب معاشرے میں صرف نعرہ مستانہ کے طور پر باقی رہ گیا، لیکن نعروں سے کسی قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتی کسی قوم کی کیا کسی فرد کی بھی تقدیر میں نعرے ذرہ بھر تغیر برپا نہیں کر سکتے، نتیجہ یہ ہے کہ نعروں کے غبار میں دین کے وہ بنیادی تعلیمات جو تمام قوموں، تمام مذاہب یا تمام فرقوں اور روئے زمین پر آج بھی موجود تمام گروہوں میں مشترک تھیں اور آج بھی مشترک ہیں، نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں اس جرم کے ذمہ داروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآاَنْزَلْنَامِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ م بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (۱)

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں جب کہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں.

اللہ تعالیٰ کے ان روشن تعلیمات کا ایک اہم نکتہ یہ تھا

شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ (۲)

کہ اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا، جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمد) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ، یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار گزری ہے.

وہ دین جو ازل سے ابد تک تمام اقوام، تمام گروہوں اور تمام مذاہب میں مشترک ہے اس کی تفصیل سورت انعام اور سورت بنی اسرائیل میں پیش کی گئی اور اسے پوری دنیا کی متفقہ صراط مستقیم کہا گیا جس سے انکار کی جرات نہ کسی مسلم کو ہے، نہ کسی غیر مسلم کو حتی کہ ملحد اور بے دین بھی اس سے انکار نہیں کرتا، صراط مستقیم کی تفصیل یہ ہے ☆ شرک نہ کرو ☆ والدین سے حسن سلوک کرو ☆ اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو ☆ فواحش کے قریب نہ جاؤ ☆ بے گناہ کو قتل نہ کرو ☆ مال یتیم باطل طریقے سے نہ کھاؤ ☆ ناپ تول میں کمی نہ کرو ☆ انصاف کا دامن پکڑو ☆ اللہ کے عہد کو پورا کرو ☆ یہی سیدھا راستہ ہے جو بتایا جا رہا ہے دوسرے راستوں پر نہ چلو.

ان احکام کو احکام عشرہ کہا گیا ہے اور سورت بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ میں اسے دہرایا گیا ہے اور پھر قرآن میں مختلف مقامات پر بار بار اس کا اعادہ کیا گیا، ان اصولوں پر عمل درآمد کی اصل ذمہ داری اہل دین پر عائد ہوتی ہے یہ اصول حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں کیونکہ حقوق العباد کی ادائیگی کے بغیر صرف پانچ عبادتیں نجات کے لیے کافی نہیں اس لیے قران کریم میں اللہ تعالیٰ نے نیکی کی وضاحت ان لفظوں میں بیان کی.

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۳)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو، یوم آخرت کو، ملائکہ کو، کتاب کو، اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے نماز قائم کرے، زکوۃ ادا کرے، اور نیک لوگ وہ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی متقی ہیں.

نیکی کا یہ حرکی تصور آج کل ہم سب سے خارج ہو گیا ہے اور جہاں موجود بھی ہے وہاں اس تصور کو وہ اہمیت اور مقام حاصل نہیں ہیں جو قران کو مطلوب ہے، قران کریم نیکی کی اس حرکی اور انقلابی تصور کو مزید آسان اور مختصر لفظوں میں بیان کرتا ہے،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۴)

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ) میں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو،

اس تصور کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۵)

لعنت ہے، تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو غفلت برتتے ہیں ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں لوگوں کو دینے سے گریز کرتے ہیں.

قرآن کریم کی نظر میں دینداری کا حقیقی مقام مروجہ دینداری سے قدر مختلف ہے، قرآن کریم کے حرکی اور برقی تصور حیات کی ایک روشن جھلک مشرکین اور منافقین کے ساتھ قیامت کے دن مختلف سلوک کی صورت میں ملتی ہے، سورت بقرۃ میں ارشاد ہوا کہ ہر گناہ کی بخشش ہے سوائے شرک کے، شرک کو سنگین ترین جرم قرار دیا گیا لیکن مشرک کو جہنم کے نچلے درجے میں رکھنے کے بجائے یہ درجہ منافقین کے لیے مختص کیا گیا، قرآن کریم میں خداوند کریم کے الفاظ کچھ یوں ہے

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا (۶)

یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے،

اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرک ایک مؤقف اختیار کر کے اس پر قائم ہو جاتا ہے، لیکن منافق کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے اس کا حال حلیہ، چال چلن، شکل وصورت اور ظاہری ہیئت لوگوں کے لیے متاثر کن ہوتی ہے، لیکن اس کے اعمال لوگوں میں دین سے نفرت پیدا کرتے ہیں، یہ نفرت بندے کو اللہ سے دور کرتی ہے اور مخلوق کو خالق سے دور کرنے کے سنگین جرم کی پاداش میں منافق کو جہنم کے نچلے درجے میں رکھا گیا ہے، نیکی یہ تصور قران کی روشنی میں ہمارے مروجہ اعمال سے بہت مختلف ہے اسی لئے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ

دنیا میں اللہ کا عذاب کسی قوم پر، داڑھی نہ رکھنے، نمازیں نہ پڑھنے، وظائف نہ کرنے، چلے نہ کھینچنے، جلسے جلوسوں میں شرکت نہ کرنے پر نہیں آیا بلکہ قوموں پر جب بھی عذاب بھی آیا، اس کا بنیادی سبب انسان کے حقوق کی پامالی، عدل وانصاف کا خاتمہ، سرکشی، فواحش اور فتنہ وفساد کا عروج بنا، جب زمین فساد سے بھر گئی اور انسانوں پر انسان کی خدائی قائم ہوگئی تو اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا کہ انسانوں کو نجات دی جا سکے، قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون، قوم موسیٰ، قوم مدین، قوم لوط کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان پر عذاب صرف اس لیے آیا کہ انہوں نے زمین کو ظلم سے بھر دیا اور لوگ چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی اور جب مدد آئی تو بستیاں الٹ دی گئیں اور اہل خیر کو ظلم سے نجات دے دی گئی.

قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس ظلم وبربریت کی اصل بنیاد دنیا سے بے پناہ محبت اور دنیا کی ہر نعمت وآسائش کو اپنی مختصر زندگی میں سمیٹ لینے کی خواہش رہی اور تمام جنگیں، خوں ریزیاں، صرف ہوس ملک گیری کے لیے تھیں تاکہ دنیا کے تمام خزانے جمع کر لیے جائیں اور دولت کے بل پر عزت، عظمت، شوکت اور جبروت کے ترانے تاریخ کی دیواروں پر ہمیشہ کے لئے آب زر سے تحریر کر دیے جائیں۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری مال ودولت سے بے پناہ پیار، الفت اور محبت ہے اور یہی محبت دنیا میں غربت، افلاس، خوں ریزی اور خونخواری کے فروغ کا باعث ہے، قرآن کریم میں رب ذوالجلال نے صاف اور واضح الفاظ میں یوں ارشاد فرمایا ہے

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۷)

تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتے اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔

ان سب جرموں کا مرتکب انسان کیوں بن جاتا ہے اس لیے کہ

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۸)

وہ مال ودولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے،

یہ مال ودولت سے ان کی یہ محبت اتنی کیوں ہے؟ اس لیے کہ

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۹)

تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے.

اس محبت کی زندہ ترین علامت یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف بلکہ اکثر علاقوں میں آج بھی عورت کو ترکے میں حصہ نہیں دیا جاتا اور میراث کا مال سمیٹ کر کھا لیا جاتا ہے مال کھانے والوں میں نہ صرف عوام الناس مبتلا ہیں بلکہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مختلف مسلک ومذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس ظلم کے خلاف آج تک ان خطوں میں کوئی تحریک نہیں اٹھائی گئی،

قرآن کریم کتاب انفاق ہے جو مسلمانوں کو، انسانوں کو اور تمام انسانیت لیے اور کے مخلوق کے لیے مال خرچ کرنے کی دعوت دیتی ہے، قرآن کریم نے ایمان کی کسوٹی انفاق فی سبیل اللہ کو قرار دیا، تزکیہ نفس کے لیے بار بار صدقہ، خیرات، زکوۃ، قرض حسنہ

دینے پر اکسایا، اہل ایمان کی صفت بار بار یہ بیان کی گئی کہ وہ اللہ کی راہ میں کھلے اور چھپے، خوشحالی اور تنگ دستی، ہر حال میں خرچ کرتے ہیں اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ محبت مال سے ہوتی ہے اور اس لیے قرآن کریم قدم قدم پر اس محبت کو اللہ کی خاطر اس کے بندوں میں تقسیم کرنے کی تلقین کرتا ہے، قرآن انفاق کے بارے میں بار بار ہدایت کرتا ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (۱۰)

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا اور جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بڑا اجر ہے،

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بخل اور بخل پر اکسانے والوں کی یوں مذمت بیان فرمائی ہے

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ نِ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۱۱)

اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا، جو فخر جتاتے ہیں جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں،

اسی طرح اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے قربانی دینے والوں کی یوں منقبت فرمائی ہے

وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۲)

جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے یہی تمہارے لیے بہتر ہے،

قرضہ حسنہ دینے والوں کی یوں توصیف فرمائی ہے

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (۱۳)

کون ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کرے،

غریبوں کی مدد کرنے، خیرات اور صدقات دینے والوں کو یوں تاکید فرماتا ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۴)

اے ایمان والو! تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو کوئی ایسا کرے گا سو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں روزی دی ہے اس سے پہلے کہ کسی کو تم میں سے موت آ جائے تو کہے اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لیے ڈھیل کیوں نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیک لوگوں میں ہو جاتا،

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس نے اپنے ہی بھلائی کے لیے غریبوں، بے بس اور بے کس لوگوں پر خرچ کیا اور اپنے دل کو بری لالچ سے بچایا تو یہ کامیاب و کامران لوگ ہیں، ارشاد ربانی ہے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵)

پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرو اور سنو اور حکم مانو اور اپنے بھلے کے لیے خرچ کرو اور جو شخص اپنے دل کے لالچ سے محفوظ رکھا گیا سو وہی فلاح بھی پانے والے ہیں،

اوران لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کیا فرماتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مال کی محبت نے مجھے برباد کر ڈالا ارشاد ربانی کو ذرا پڑھیے!

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۱۶)

کہتا ہے کہ میں نے مال برباد کر ڈالا، کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا، کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور زبان اور دو ہونٹ اور ہم نے اسے دونوں راستے دکھائے پس وہ (دین کی) گھاٹی میں سے نہ ہو کر نکلا اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ گردن کا چھوڑانا یا بھوک کے دن میں کھلانا کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی خاک نشین مسکین کو، پھر وہ ان میں سے ہو جو ایمان لائے اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور رحم کرنے کی وصیت کی،

اور جو لوگ کثرت مال کے نشے میں مست ہیں اور دنیا کے حصول نے اسے غفلت کے نیند سلا دیا ہے اس کے بارے میں ارشاد ربانی ملاحظہ فرمائیں

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (۱۷)

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال کر رکھا ہے یہاں تک کہ (اس فکر میں) تم قبر تک پہنچ جاتے ہو اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے اس روش کے انجام کو جانتے (تو تمہارا طرز عمل یہ نہ ہوتا) تم دوزخ دیکھ کر رہو گے،

اس طرح دنیا کے دھن میں محو لوگوں کے بارے میں ارشاد ربانی ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ (۱۸)

تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو لوگوں پر طعن اور برائیاں کرنے کا خوگر ہے جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا،

اور جو لوگ یتیموں سے برا سلوک کرتا ہے اور مساکین کو خود بھی کچھ نہیں دیتے اور دوسروں کو بھی نہیں اکساتے کہ وہ ان لاچاروں پر خرچ کر سکیں اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۹)

تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا،

یہ مال و دولت، یہ خزانے یہ ڈالر و دینار، یہ پونڈ و دراہم کسی کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا ہے بلکہ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو نہ وہ بچ سکتا ہے نہ اس کا مال بچ سکتا ہے نہ اسے اس کا مال بچا سکتا ہے ملاحظہ فرمائیں ارشاد باری تعالیٰ۔

تَبَّتْ يَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (۲۰)

ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ نامراد ہوگیا وہ اس کا مال جو کچھ اس نے کمایا اس کے کسی کام نہ آیا،

مال ودولت کی یہی فراوانی سرکشی اور طغیاں پر اکساتی ہے دولت کی کثرت قوموں کو تاریخ میں ہمشہ زندہ رہنے کے لیے مقابر، آثار، عمارات اور عالیشان شہر تعمیر کرنے کے لیے اکساتی ہے مگر اس کا انجام یہ ہے کہ:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (۲۱)

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب سے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ، جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں اور میخوں والے فرعون کے ساتھ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی.

قرآن کریم جس معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتا ہے اس معاشرے کا ہر فرد آیات الٰہی کا زندہ پیکر ہوتا ہے، دولت کی کثرت اس میں فخر کے بجائے عاجزی پیدا کرتی ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ

الَّذِیْ يُؤْتِیْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰی وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی وَلَسَوْفَ يَرْضٰی (۲۲)

وہ تزکیہ نفس کی خاطر اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے.

تزکیہ نفس کا یہ عمل اس کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ ہوتا ہے

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۲۳)

اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی گئی یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبایا.

اسلامی تعلیمات میں شب بیداری اور تلاوت قران مجید کی ہدایت کی گئی ہے مگر اس کے علاوہ قران کریم میں مختلف مقامات پر تزکیہ نفس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے بار بار اور جگہ جگہ مال ودولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت کی ہے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (۲۴)

ان کے مالوں میں سے زکوۃ لے کہ اس سے ان کے ظاہر کو پاک اور ان کے باطن کو صاف کردے اور انہیں دعا دے،

قرآن کریم مال ودولت کو گن گن کر رکھنے والوں کو تنبیہ کرتا ہے اور پرزور وعید سناتا ہے

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰی عَلَيْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۲۵)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا

دیجئے جس دن وہ دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھ داغے جائیں گی یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو اس کا مزہ چکھو جو تم جمع کرتے تھے،

یہ سزا انہیں اس لئے دی جائے گی کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا جواز یہ ڈھونڈتے تھے، قرآن کریم کے الفاظ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۶)

جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ جو رزق تمہیں دیتا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو یہ ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا تم بالکل ہی بہک گئے ہو۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ رشتہ داروں، مسکینوں، مسافروں اور غلاموں کو مال دینے کی ترغیب دی ہے مگر قرآن کریم نے کہیں بھی رفاہی اداروں، اس طرح دیگر اداروں کو (جو زکوۃ اور صدقات کا واحد محور اپنے آپ کو گردانتے ہیں اور یہ ترغیب دیتے ہیں کہ اگر کوئی مال دینا ہے تو صرف ہم کو دو، اور ہم ہی اسی کے مستحق ہے) مال دینے کی ہدایت نہیں دی اس کا مطلب یہ نہیں کہ رفاہی اداروں کو مال دینا ممنوع ہے مگر قرآن کا سارا زور اس بات پر ہے کہ اہمیت قریبی رشتہ داروں، ماں باپ، ہمسائے، مساکین اور فقراء اور اللہ کی راہ میں مشغول اہل دین کو دی جائے، کیونکہ معاشرے کی ضرورت مندوں کی کفالت دولت مندوں کی ذمہ داری ہے، قرآن کی نظر میں بخل، کنجوسی سنگین ترین جرم ہے، اس جرم کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سورت محمد میں اللہ تعالیٰ نے کنجوس مسلمان قوم کی جگہ کسی اور قوم کو لانے کی وعید دی ہے۔

هَآ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۲۷)

تم لوگوں کو دعوت دی جارہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اس پر تم ہی میں سے کچھ لوگ بخل کر رہے ہیں حالانکہ یہ بخل جو کر رہے ہیں وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ تو غنی ہے، تم ہی اس کے محتاج ہو، اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لائے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

مال و دولت کو خرچ کرنے کے سلسلے میں قرآن کی بے شمار آیات کا اثر یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ ہر وقت انفاق فی سبیل اللہ میں مصروف رہتے قرآن کریم ان کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتا ہے،

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۸)

اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

قرآن عام آدمی کو اللہ کی راہ میں مسلسل اور مستقل خرچ کر دینے کا حکم دیتا ہے تو حکمرانوں کے بارے میں اس حکم کی شدت مزید بڑھ جاتی ہے اس لیے اسلام میں حکمرانوں کا کام دولت سمیٹنا نہیں دولت بانٹنا ہے، یہیں وجہ ہے کہ صدر اول کے معاشرے میں ایوان حکومت میں خود اختیاری فقر تھا، اس لیے رعایا خوشحال، فارغ البال اور مرفع الحال تھی، جب ایوان حکومت میں امارت غلبہ

پالے تو عام آدمی کے در و دیوار پر غربت اگنے لگتی ہے، عصر حاضر کی تمام مسلم ممالک کا حال یہی ہے کہ حکمرانوں کو محلات میسر ہے مگر عام آدمی کو رہنے کے لیے کٹیا بھی میسر نہیں، لیکن قرن اول کے حکمران چھوٹے موٹے حجروں میں رہتے اور پتھر کو تکیہ بنا کر سو جاتے، مگر ان کی رعایا اتنی خوشحال تھی کہ زکوۃ لینے والا کوئی نہ تھا۔

رسالت مآب ﷺ نے صحابہ کرام کے دلوں سے مال و دولت کی محبت نکال کر انہیں خدمت خلق کے کاموں میں خرچ کرنے کا راستہ بتایا تھا، لہٰذا وہ معاشرہ سادگی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا رسالت مآب ﷺ ایک مرتبہ راستے سے گزرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی فرمایا کس کا مکان ہے؟ لوگوں نے ایک صحابیؓ کا نام لیا آپ خاموش ہو گئے جب وہ صحابی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو منہ پھیر لیا، انہوں نے دوستوں سے ناراضگی کا سبب دریافت کیا تو واقعہ بتایا گیا وہ گئے اور مکان منہدم کر دیا، لوگوں نے سارا واقعہ آپ کو سنایا فرمایا: ہر وہ مکان جو ضرورت سے زائد ہو صاحب خانہ پر وبال ہے'' صحابہ کرامؓ کو ہدایت کی کہ جب گھر پھل لاؤ تو ہمسایہ کو بھی بھیجو اور اگر نہ بھیج سکو تو اس کے چھلکے باہر نہ پھینکو اس سے بچوں کو اذیت پہنچے گی معمولی پھل کے چھلکوں سے بچوں کو پہنچنے والی اذیت رسول اللہ ﷺ کو گوارا نہ تھی تو یہ بات کیسے گوارا ہوتی کہ مدینۃ النبی میں جب عام لوگوں کے پاس عالیشان مکان نہیں ہیں تو چند لوگ ایسے مکانات کیوں تعمیر کریں جب انہیں اس کی ضرورت بھی نہ ہو، اس اصول کے تحت اسلامی معاشروں پر اور اپنے ارد گرد نظر ڈالی جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس معاشرے، جس ملک اور جس شہر میں لوگوں کو رہنے کے لیے چند گز کا گھر دستیاب نہیں وہاں عالیشان محلات کا وجود مرد مؤمن کا دل کیسے گوارا کر سکتا ہے؟ پھلوں کے چھلکوں سے دلآزاری کو روکنے والی شریعت عالیشان محلات کی صورت میں مستقل دلآزاری کیسے گوارہ کر سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں دن بدن غربت بڑھتی جا رہی ہے اور عام آدمی اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے سے قاصر ہے، ہاتھ پھیلانے والے مانگ کر حصہ وصول کر لیتے ہیں مگر غیرت مند لوگ جنہیں مسکین کہا گیا ہے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور وہ لوگ جو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے حمیت کی تصویر بن جاتے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۹)

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، ان کی خودداری کو دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوشحال ہیں تم ان کے چہروں سے ان کی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہیں رہے گا۔

ان عظیم الشان تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ نہ صرف مال اللہ کی راہ میں کثرت سے خرچ کیا جائے بلکہ درست طریقے سے خرچ کیا جائے اور ان تنگ دست لوگوں کو تلاش کیا جائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مدد کا خاص مستحق قرار دیا ہے، وہ غیرت مند لوگ کہ ان کی آنکھ اٹھتی ہے، نہ ان کے ہاتھ اٹھتے ہیں، نہ ان کی زبان کھلتی ہے، نہ ان کے ہونٹ ہلتے ہیں جن کے چہرے استغناء کے نور سے

جگمگاتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ضرورت مند نہیں ہیں، قرآن نے دیندار ضرورت مندوں کے لیے غیرت مند ہونے کی شرط عائد کی ہے جو اس معیار پر پورے نہ اتریں وہ انفاق کے مستحق ہی نہیں ہے اور فی الحقیقت دین دار بھی نہیں ہیں، یہ اہل دنیا ہیں جنھوں نے اپنی گزر اوقات کے لیے مذہب کی چادر اوڑھ لی ان کا ظاہر و باطن مختلف ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ مغضوب لوگ ہیں ایسے لوگوں کو پہچاننا اور اہل اللہ اور ان کے درمیان فرق تلاش کرنا ہر شخص کا فریضہ ہے۔

مصادر و مراجع

۱	البقرہ: ۱۵۹	۸	العادیات: ۸	۱۵	التغابن: ۱۶	۲۲	اللیل: ۲۱-۱۸
۲	الشوریٰ: ۱۳	۹	الاعلیٰ: ۲۶	۱۶	البلد: ۷-۱۸	۲۳	الشمس: ۱۱-۸
۳	البقرہ: ۱۷۷	۱۰	الحدید: ۷	۱۷	التکاثر: ۱-۸	۲۴	التوبہ: ۱۰۳
۴	ال عمران: ۹۲	۱۱	الحدید: ۲۴	۱۸	الھمزۃ: ۱-۳	۲۵	التوبۃ: ۳۵-۳۴
۵	الماعون: ۷-۴	۱۲	الصف: ۱۱	۱۹	الماعون: ۱-۳	۲۶	یسین: ۴۷
۶	النساء: ۱۴۵	۱۳	الحدید: ۱۱	۲۰	اللھب: ۱-۲	۲۷	محمد: ۳۸
۷	الفجر: ۱۷-۲۰	۱۴	المنافقون: ۹	۲۱	الفجر: ۱-۶	۲۸	الحشر: ۹

۲۹ البقرہ: ۲۷۳

محترمہ آمنہ ارشد
سرگودھا یونیورسٹی گجرات

استشراق
آغاز وارتقاء، مقاصد وطریق کار

استشراق کا معنی ومفہوم

لفظ استشراق کا مادہ ش، ر، ق ہے اور یہ باب استفعال سے مصدر ہے، باب استفعال کے خاصہ طلب کیوجہ سے اس میں لفظ طلب کا مفہوم ادا کر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کا اردو ترجمہ شرق شناسی کیا گیا ہے(۱)

استشراق کی جو تعریف عام طور پر مشہور ہے وہ یہ ہے:

غیر مشرقی لوگوں کا مشرقی زبانوں، تہذیب، فلسفے، ادب اور مذہب کے مطالعے میں مشغول ہونے کا نام استشراق ہے(۲)

مشرقی لوگوں کی خصوصیات اور عادات یا اظہار کے طریقوں پر مغربی مفکرین کی آراء اور طرزِ عمل استشراق کہلاتا ہے

Orientalism is a style of Thought based upon ontological and epistemological distinction mode between the orient and most of time the ocident.

مستشرقین ایک اندازِ فکر کا نام ہے جس کی بنیادیں انسانی علوم کی اساس اور دوسرے مابعد الطبیعاتی نظریات کے بارے میں مستشرقین اور مستغربین کی آراء کے تفاوت پر قائم ہیں(۳)

ان تعریفات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اہل مغرب بالعموم اور یہود ونصاریٰ بالخصوص، جو مشرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب وتمدن، تاریخ، ادب ووسائل اور حیات وامکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کر سکیں اور ان پر سیاسی غلبہ حاصل کر کے ان کے وسائل حیات کا استحصال کر سکیں، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے اور جس تحریک سے یہ لوگ منسلک ہیں وہ تحریک استشراق کہلاتی ہے۔

استشراق کا پس منظر

مستشرقین کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار احمد اپنے مضمون ''مستشرقین اور مطالعہ سیرت'' میں رقم طراز ہیں:

اسلام اور ادیان غیر میں بڑے بڑے بنیادی اختلافات ہیں، اسلام کا نظریہ حیات، نظام فکر وعمل اور تہذیب وتمدن کا

اظہار، یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے، اس لیے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں اور اپنے بغض وعناد کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کرتے ہیں، ان کا یہ رویہ اور شقاوت وقساوت، دراصل نظریاتی اور فکری بنیادوں پر استوار ہے، جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کے پورے گروہ میں نمایاں ترین عناصر یہود ونصاریٰ اور مشرکین ہیں، انہیں اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کی سرفرازی کسی طور پر پسند نہیں بلکہ وہ ہر آن زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں، اس لحاظ سے تحریک استشراق کی اٹھان اسلام دشمنی کے زیر سایہ ہوئی اور مستشرقین کی مساعی کا ہدف یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو دنیا کے سامنے کریہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے (۴)

درج بالا گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تحریک استشراق محض حادثاتی نہیں تھی بلکہ مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی سے اس کا آغاز کیا گیا.

استشراق کا آغاز وارتقاء

دین اسلام کے آغاز سے ہی اس کی مخالفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اس لیے اگر تاریخ کے صفحات پر نظر دوڑائیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نبی مہربان ﷺ کی حیات طیبہ کے مکی دور میں ہی یہودی اور مسیحی دین اسلام پر اعتراضات کی ابتدا کر چکے تھے اور مخالفت کرنے میں وہ قریش کے بت پرستوں کے ہم نوا تھے، مدینہ منورہ کے دس سالہ دور میں یہ مخالفت اور زیادہ شدت اختیار کر گئی، خصوصاً یہودیوں نے دین اسلام کی پرزور مخالفت کی اور دشمنانِ حق نے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھا، خلافت صدیقی اور فاروقی میں جب اسلام عرب کی حدود سے باہر نکلا اور عراق وشام کی سرزمین فتح ہوئی اور مسلمانوں کا ان علاقوں کے لوگوں سے میل جول ہوا تو اسی دور کے عیسائی علمائے مذہب نے اسلام اور اس کی تعلیمات، قرآن مجید اور سیرت رسول ﷺ کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے شروع کر دیے تھے تا کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق تشکیک کا جذبہ پیدا کر کے قبول اسلام سے روکا جا سکے.

استشراق کے اغراض ومقاصد

مستشرقین اپنے اصل ارادوں کو خفیہ رکھنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن ان کے پروگراموں، تحریروں اور کانفرنسوں وغیرہ میں ان کے بیانات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اہل مغرب جو مشرق خصوصاً اسلام پر اتنی زیادہ توجہ دیتے ہیں، ان کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ مستشرقین کے مقاصد تو متعدد ہیں لیکن اختصار کے طور پر ان مقاصد کو چار عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

☆ دینی مقاصد ☆ علمی مقاصد ☆ اقتصادی مقاصد ☆ سیاسی مقاصد

دینی مقاصد

تحریک استشراق کا تعارف تو علمی تحریک کے طور پر ہے، لیکن تحریک استشراق کے طالب علم کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ اس تحریک کا بنیادی مقصد دینی تھا، بلال وصہیب کے درمیان جو معرکہ آرائی رہی، اس کے بنیادی اسباب دینی تھے، اس

معرکہ آرائی میں جب مسیحیوں کو میدان جنگ میں شکست ہوئی اور انہوں نے محسوس کرلیا کہ اس طرح وہ اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکے اور اسلام سرعت سے پھیلتا جارہا ہے؟ تو انہوں نے اور بالخصوص کلیسا نے مشرقی علوم کی طرف توجہ کی جو کہ اسلام کے راستے میں بند باندھنے کی کوششوں کا حصہ تھی.

علمی مقاصد

مستشرقین کی پوری تحریک علمی لبادے میں کام کرتی ہے، یونیورسٹیوں میں علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کرنا، اطراف عالم میں ادارے قائم کرنا، مخطوطات جمع کرنا، مختلف کتابوں کی تحقیق کرنا، کتابوں کو شائع کرنا، عربی کتابوں کے مختلف زبانوں میں تراجم کرنا، مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف کرنا، یہ تمام کام علمی کاوشوں کے زمرے میں آتا ہے، ان تمام علمی کاوشوں کے پیچھے علم کی خدمت کا جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ علم کی خدمت کے لبادے میں دراصل اسلام اور اہل اسلام سے مقابلہ مقصود تھا لیکن یہ اصول تمام مستشرقین پر لاگو نہیں ہوتا، انہی مستشرقین میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جن کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے صرف علم کے حصول اور علم کی خدمت کے جذبہ سے اپنی زندگیاں تحقیق کے میدان میں صرف کیں، اس لیے ایسے مستشرقین کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا حق اور دیانت کے خلاف ہوگا۔

اقتصادی مقاصد

تحریک استشراق اور مستشرقین جن اعراض واہداف کے حصول کے لیے اقوام مشرق کی طرف متوجہ ہوئے ان مقاصد میں اقتصادی اہداف بھی ان کے پیش نظر تھے، الدکتور محمد عبدالمتعال الجبری رقم طراز ہیں: مستشرقین کے پیش نظر اقتصادی مقاصد بھی تھے، انہی مقاصد کے حصول کے لیے وہ مشرقی اقوام، مذاہب، لسانیت ودیگر حالات کی طرف متوجہ ہوئے، اس کا آغاز تیرہویں صدی عیسوی سے ہی ہوگیا تھا، جب تیونس اور وینس کے تاجروں نے آپس میں تجارتی معاہدہ کیا تھا (۵)

سیاسی مقاصد

مستشرقین جن مقاصد کے حصول کے لیے اقوام مشرق کی طرف متوجہ ہوئے، ان میں سیاسی مقاصد سرفہرست تھے، اہل مغرب نے مسلمانوں کے ممالک پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا لیکن اس مقصد کے لیے تلوار کے استعمال کو خلاف مصلحت سمجھا اور انہوں نے انسانوں کو ایسی جماعتیں تیار کیں جنہوں نے علم کی محبت اور خدمت انسانیت کے حسین جامے زیب تن کر رکھے تھے، ان کا کام یہ تھا کہ وہ ممالک اسلامیہ میں ایسے حالات پیدا کریں کہ جب علمی طور پر اہل مغرب، ان ممالک پر اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کے لیے آگے بڑھیں تو ان ممالک کے شہریوں کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا امکان نہ ہو، جو لوگ ان کے مقاصد کے حصول کے لیے میدان میں اتارے گئے وہ دو حصوں میں تقسیم کیے گئے، ایک وہ طبقہ جنہوں نے علم کے شیدائیوں کا روپ دھارا، اس طبقے کو مستشرقین کا نام دیا گیا، دوسرا گروہ وہ تھا جنہوں نے اہل مشرق خصوصاً مسلمانوں کو مختلف تدبیروں کے ذریعے عیسائیت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، اس گروہ کو مبشرین کا خوبصورت لقب دیا گیا.

ان گروہوں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے، اہل مغرب سمجھ گئے تھے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر ان کے عقیدے کی گرفت ختم ہوجائے یا کمزور پڑ جائے تو یہ قوم پارہ پارہ ہوسکتی ہے، ان مستشرقین اور

مبشرین دونوں گروہوں نے درج بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، اسلامی عقیدے پر حملے شروع کر دیے، پیغمبر اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کا مرکز ہیں، ان کی ذات بابرکات پر ایسی الزام تراشیاں کیں کہ شرافت، ندامت کے باعث منہ چھپانے پر مجبور ہو جاتی ہے، قرآن حکیم کو آپ ﷺ کے ذہن کا اختراع کہا گیا، مسلمانوں کو اسلامی اقدار سے بے بہرہ کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی گئی، ایسی تعلیم کو فروغ دیا گیا کہ جو مسلمان کو مسلمان نہ رہنے دے، مسلمان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ ان کا ۱۴ سو سال پرانا فرسودہ دین آج کے دورِ جدید کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، مسلمانوں کے نظام جزا و سزا کو وحشیانہ قرار دیا گیا، مسلمانوں کی زندگی سے جہاد کو خارج کرنے کی کوشش کی گئی، انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ وہ مسلمان بعد میں پہلے عرب، ترک، ایرانی اور افغانی ہیں، اس طرح نسلی، لسانی، علاقائی اور جغرافیائی تعصّبات کو بھڑکا کر مسلمانوں کو منتشر کرنے کی کوشش کی گئی۔

حکمت عملی اور طریق کار

سولہویں صدی عیسوی تک کے مستشرقین اس امر پر متفق ہو چکے تھے کہ اسلام سے نمٹنے کے لیے محض فوجی کارروائی کافی نہیں بلکہ نظریاتی جنگ اشد ضروری ہے، مفکرین کی تجاویز کے مطابق نئے محاذ کے لیے حسب ذیل حکمت عملی ضروری ہے:

☆ السنہ مشرقی خصوصاً عربی زبان سے واقفیت ☆ علوم اسلامی کا مطالعہ تاکہ کمزور پہلوؤں کو دریافت کر کے وہاں سے دباؤ ڈالا جا سکے ☆ ازالۂ اسلام کے لیے مناسب دلائل کی فراہمی ☆ مسیحی تقدس سے لبریز فلسفہ جو عالم اسلام کے اذہان کو متاثر کر سکے ☆ ایسا لٹریچر جو مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی ختم کر سکے ☆ تبلیغی سرگرمیاں تاکہ مسلم معاشرے کو عیسائی بنایا جا سکے

حکمت عملی میں متعین کردہ اہداف کے حصول کے لیے مستشرقین نے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا۔

☆ ایسے آدمی تیار کیے جو مسلمانوں کی زبانوں، ان کے دین، ان کی تہذیب و تمدن، عقائد، تاریخ، اختلافات اور دیگر مظاہر حیات سے پوری طرح آگاہ ہوں وہ مسلمانوں کے ساتھ ان کی زبان میں گفتگو کر سکیں، وہ ان میں گھل مل سکیں اور وہ مسلمانوں کے عقائد اور مذہبی اعمال کو اس انداز میں دیکھنے اور پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہوں جو مستشرقین کے مؤقف کے مطابق ہوں۔

☆ ان تربیت یافتہ لوگوں کو اسلامی ممالک میں تبلیغی مشن کے لیے بھیجا جائے جہاں وہ مختلف فلاحی اور خیراتی کاموں کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں کو عیسائیت کی طرف مائل کر سکیں۔

☆ اس مساعی میں کامیابی کے لیے مغربی سیاستدانوں سے گٹھ جوڑ کیا جائے تاکہ ان کی حمایت سے تبلیغی کوششیں بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہیں.

☆ سرمائے کی فراہمی کے لیے حکومتوں کے علاوہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کے ساتھ بھی رابطے کیے جائیں.

☆ اپنے کام کو منظم کرنے، اس کی رفتار کو تیز کرنے اور تبلیغی کوششوں کا رخ متعین کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً کانفرنسز منعقد کی جائیں (۶)

چنانچہ مستشرقین نے اپنی طے کردہ حکمت عملی کو مندرجہ بالا طریق کار کے مطابق آگے بڑھا کر اپنے اہداف کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔

مستشرقین کی غلطیاں

طرزِ فکر، اندازِ بحث اور طریقہ تحقیق میں مستشرقین نے جو بنیادی غلطیاں کی ہیں، ان میں سے کچھ کی نشاندہی ذیل کی سطور میں کی جارہی ہے:

☆ پہلی غلطی یہ ہے کہ بعض اوقات مستشرقین ضعیف روایات کو لے کر انہی کی بنیاد پر فیصلہ سنا دیتے ہیں.

☆ دوسری یہ کہ اسلام اور سیرت نبوی ﷺ کے کارناموں کو وہ عیسائی یا یہودی اصولوں کا دین سمجھتے ہیں اور اسلام کے محاسن کا سہرا عیسائیت کے سر باندھتے ہیں.

☆ تیسری غلطی یہ کہ مستشرقین اسلام مطالعہ میں معکوس طریقہ ونہج اختیار کرتے ہیں اور نتائج کے استنباط میں بجائے عقل کے ذوق پر اعتماد کرتے ہیں.

☆ چوتھی غلطی یہ کہ مستشرقین اسلام دشمن عناصر پر بڑا مہربان ہوتے ہیں خصوصاً یہودیوں کے لیے بڑا نرم گوشہ اختیار کرتے ہیں.

☆ پانچویں یہ کہ ان مستشرقین نے سنت اور تاریخ کے عطایا اور ثمرات میں شکوک وشبہات پیدا کیے اور اپنے ذوق طبیعت اور مرضی سے ان کی نفی کی یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے اسم مبارک میں شکوک پیدا کیے.

☆ چھٹی غلطی یہ کہ مستشرقین کی تحریروں میں لامذہبی، غیر معیاری اور غیر منطقی طرزِ استدلال نمایاں ہے اور وہ سیرت کے زمانے کو موجودہ زمانے کے معیار کے مطابق پرکھتے ہیں۔

خلاصہ بحث

مستشرقین کی تحقیقات کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مستشرقین نے اسلام کو حامیوں کا منبع قرار دیتے ہوئے اپنے تعصب، اسلام دشمنی، حسد، عناد کا اظہار کیا ہے، انہوں نے کمزور حدیثوں کا سہارا لے کر شکوک وشبہات پیدا کیے ہیں، اسلام کے حقیقی اغراض ومقاصد کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنا، اپنے مطابق قرآن میں تحریف کرنا اور قرآن وحدیث کو توڑ موڑ کر پیش کیا ہے، اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ، اسلامی تعلیمات جہاد کے بارے میں مغرب میں گمراہ کن اور جھوٹے مفروضے بنائے ہیں اور اسلامی تاریخ وواقعات کو شکوک وشبہات پیدا کیے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو باطل تحریکات کا اصل چہرہ دکھانے اور اس کے مقابلے کی ہمت بھی عطا فرمائے، آمین

مصادر ومراجع

(۱) پروفیسر، ڈاکٹر محمد اکرم چودھری: استشراق، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱/۵۶۵ (۲) Edward Saed, Orientalism,2

(۳) الدکتور احمد دیاب "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین" ۱۰ (۴) ڈاکٹر نثار احمد: مستشرقین اور مطالعہ سیرت، نقوش، رسول نمبر، ۴۹۵

(۵) الدکتور محمد عبدالمتعال: الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری ۷۶ (۶) پیر محمد کرم شاہ الازہری: ضیاء النبی ﷺ، ۶/۲۴۵

مولانا عبدالجلیل بادشاہ
مدرس معہد ہذا

رمضان المبارک تقویٰ کے حصول کا بہترین ذریعہ

روزہ تقوی و پرہیزگاری کے راز، تہذیب نفس اور باطن کی پاکیزگی، صبر کی تمرین، اپنے سرکش نفس امارہ کی خواہشات کے مقابلے میں استقامت اور جدوجہد اور شیطان کے ساتھ مقابلے کا نام ہے، روزے کا اہم ترین فائدہ جس پر قرآن کریم میں بھی بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے" تقوی" کا حصول ہے، تقویٰ اور پرہیزگاری تمام نیکیوں کی جڑ اور بنیاد ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کئے گئے تھے۔

تقویٰ کیا ہے

تقویٰ کی نہایت اعلیٰ تشریح صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اس وقت فرمائی کہ جب ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے سوال کیا کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا ''کیا آپ کبھی ایسے راستے پر گزرے ہیں جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں''؟ حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا ہاں! پھر پوچھا ''آپ اس راستے کو کس طرح طے کرتے ہیں؟'' حضرت عمر فاروقؓ کا جواب تھا کہ ''میں اپنے کپڑوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لیتا ہوں، کہیں وہ جھاڑیوں میں الجھ نہ جائیں'' حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''بس یہی تقویٰ'' ہے۔

غور کیا جائے تو یہ مثال پوری دنیاوی زندگی پر صادق آتی ہے، دنیا کی یہ گزرگاہ بھی دورویہ خواہشوں اور تحریصوں کی خاردار جھاڑیوں سے بھری پڑی ہے، اس میں احتیاط نہ برتی جائے تو دامن حیات قدم قدم پر تار تار ہوسکتا ہے، قرآن حکیم کی تعریف کے مطابق متقی وہ ہے جو زندگی گزارنے میں احتیاط سے قدم بڑھائے اور اپنے دامن کو گناہوں کے کانٹوں سے بچاتا ہوا منزل مقصود پر پہونچ جائے، روزہ صرف صبح سے شام تک کھانے، پینے اور نفسانی خواہش سے پرہیز کا نام نہیں ہے بلکہ پوری ''اسپرٹ'' یا ''جذبہ'' کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادت ڈالنا، اس کا مقصد ہے، اسی لئے روزہ کے دوران گناہوں سے بچنا، فحش گوئی سے پرہیز اور لڑائی جھگڑے سے گریز ضروری ہے، نمازوں کا اہتمام اور تلاوت میں وقت گزارنا بھی روزہ کے مشاغل میں شامل ہے۔

حضرت امام غزالیؒ منہاج العابدین میں فرماتے ہیں کہ قرآن شریف میں لفظ تقویٰ تین معنوں میں آتا ہے (۱) تقویٰ عن الشرک یعنی شرک سے پرہیز کرنا (۲) تقویٰ عن المعاصی یعنی گناہوں سے پرہیز کرنا (۳) تقویٰ عن البدعۃ یعنی بدعت سے بچے رہنا۔

ماہ رمضان سے تقویٰ کا تعلق

ماہ رمضان میں تقویٰ کا حاصل کرنا آسان ہے کہ اس ماہ میں ماحول بنا ہوا ہے عبادت کا بازار گرم ہوتا ہے، رمضان کے شروع ہوتے ہی شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے، کہ وہ روزہ داروں کو نہ بھکائیں اور انکے دلوں میں وسوسوں اور گندے خیالات کا بیج نہ بوئیں، البتہ ایسے بدبخت بھی ہوتے ہیں جو اس ماہ مبارک میں بھی گناہ و معصیت سے باز نہیں آتے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ رمضان سے پہلے ایام میں شیطان کے بھکانے کی وجہ سے ان کے طبائع بد میں وہ اثرات راسخ ہوتے ہیں یعنی ان کے ذہن وفکر اور ان کے عمل قوت پہلے ہی سے شیطان کے زیر اثر ہوتی ہے اور ان کا نفس اسکا عادی ہو چکا ہوتا ہے اس لئے ایسے لوگ اپنی عادت سے مجبور ہو کر رمضان میں بھی گناہ و معصیت سے نہیں بچ پاتے، شیاطین کے قید ہونے کا مطلب ایک حدیث کے اعتبار سے یہ بھی ہے کہ اس ماہ مقدس میں صرف وہی شیاطین قید کئے جاتے ہیں جو سرکش سرغنہ ہوتے ہیں۔

بہر حال روزے کا مقصد تقوی ہے اسی تقویٰ کے حصول کے لئے اس آخری امت پر سال میں ایک مہینے کے روزے فرض کئے گئے اور روزے کا وقت طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک رکھا گیا پھر اسکے لئے مہینہ وہ مقرر کیا گیا جس میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور جس میں بے حساب برکتوں اور رحمتوں والی رات (شب قدر) ہوتی ہے ظاہر ہے کہ یہی مبارک مہینہ اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب اور موزوں زمانہ ہوسکتا تھا اسی کے ساتھ ساتھ اس مہینے میں دن کے روزوں کے علاوہ رات میں ایک خاص عبادت کا عمومی اور اجتماعی نظام قائم کیا گیا جسکو تراویح کہا جاتا ہے، جسکی وجہ سے اس مبارک مہینے کی نورانیت اور تاثیر میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور ان دونوں عبادتوں کے احادیث شریفہ میں بہت زیادہ فضائل وارشاد فرمائے گے ہیں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ من صام رمضان ایماناً و احتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه ومن قام رمضان ایمانا و احتساباً غفر ما تقدم من ذنبه (البخاری ۱:۲۷۰) جو شخص ماہ رمضان کے روزے رکھے بحالت ایمان اور بامید ثواب تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور جو شخص ماہ رمضان میں کھڑا ہوا یمان یعنی نوافل (تراویح وتہجد وغیرہ) پڑھے بحالت ایمان اور بامید ثواب اس کے بھی گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے جائیں گے۔

تقویٰ کے حصول میں معاون چیزیں

لیکن صرف روزہ رکھنے اور تراویح پڑھنے کی حد تک بات ختم نہیں ہوتی بلکہ اس ماہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ غفلت کے پردوں کو دل سے دور کیا جائے، اصل مقصدِ تخلیق کی طرف رجوع کیا جائے، گزشتہ گیارہ مہینوں میں جو گناہ ہوئے ان کو معاف کرا کر آئندہ گیارہ مہینوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے استحضار اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کے ساتھ گناہ نہ کرنے کا داعیہ اور جذبہ دل میں پیدا کیا جائے، جس کو "تقویٰ" کہا جاتا ہے، اس طرح رمضان المبارک کی صحیح روح اور اس کے انوار و برکات حاصل ہوں گے، ورنہ یہ ہوگا کہ رمضان المبارک آئے گا اور چلا جائے گا اور اس سے صحیح طور پر ہم فائدہ نہیں اٹھا پائیں گے، بلکہ جس طرح ہم پہلے خالی تھے ویسے ہی خالی رہ جائیں گے، اس لیے چند ایسی چیزوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جن پر عمل کر کے ہمیں روزے کا مقصد (تقویٰ) اور رمضان المبارک کے انوار و برکات حاصل ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عبادت کی مقدار میں اضافہ

پہلا کام یہ کہ رمضان المبارک کی برکتوں کو حاصل کرنے کے لیے اپنی عبادت کی مقدار میں اضافہ کرنا ہے، دوسرے ایام میں جن نوافل کو پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی ان کو اس مبارک ماہ میں پڑھنے کی کوشش کریں، مثلاً: مغرب کے بعد سنتوں سے الگ یا کم از کم سنتوں کے ساتھ چھ رکعت اوّابین پڑھیں، عشاء کی نماز سے چند منٹ پہلے آکر چار رکعت یا دو رکعت نفل پڑھیں سحری کھانے کے لیے اٹھنا ہی ہے تو چند منٹ پہلے اٹھ کر کم از کم چار رکعت تہجد پڑھ لیں، اسی طرح اشراق کی نماز اور اگر اشراق کے وقت نیند کا غلبہ ہو تو چاشت کی چند رکعتیں تو پڑھ ہی لیں، ظہر کے بعد دو سنتوں کے ساتھ دو رکعت نفل اور عصر سے پہلے چار رکعت نفل پڑھ لیں۔

تلاوتِ قرآنِ کریم کی کثرت

دوسرا کام یہ کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کا خاص اہتمام کرنا ہے، کیونکہ رمضان المبارک کے مہینے کو قرآن کریم کے ساتھ خاص مناسبت اور تعلق ہے، اسی مہینے میں قرآن کریم نازل ہوا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ:۱۸۵) خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی رمضان المبارک میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرمایا کرتے تھے، تمام بزرگانِ دین کی زندگیوں میں یوں تو قرآنِ کریم میں اشتغال بہت زیادہ نظر آتا ہے، لیکن رمضان المبارک کا مہینہ آتے ہی تلاوت کے معمول میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا، لہٰذا ہم کو بھی اس مبارک ماہ میں عام دنوں کے مقابلے میں تلاوت کی مقدار زیادہ کرنی ہے، عام آدمی کو بھی روزانہ کم از کم تین پارے پڑھنے چاہئیں، تاکہ پورے مہینے میں کم از کم تین قرآنِ کریم ختم ہوجائیں۔

تراویح میں قرآنِ کریم صحیح پڑھنے اور سننے کا اہتمام

تیسرا کام یہ کہ اس مبارک مہینے میں ہر مومن کو اس بات کی بھی فکر کرنی ضروری ہے کہ تراویح میں قرآنِ مجید صحیح اور صاف صاف پڑھا جائے، جلدی جلدی اور حروف کو کاٹ کاٹ کر پڑھنے سے پرہیز کیا جائے، کیوں کہ اس طرح قرآنِ کریم پڑھنا اللہ کے کلام کی عظمت کے خلاف ہے، نیز پڑھنے والے کو خود قرآنِ کریم بددعا دیتا ہے (احیاء العلوم ۱/ ۲۷۴، فی ذمّ تلاوۃ الغافلین) اس طرح قرآن کریم پڑھنے والا اور سننے والے سب گنہگار ہوتے ہیں، خدارا اس صورتِ حال سے بچیئے ور اس مبارک مہینے میں برکتوں اور رحمتوں کے دروازے کو اپنے اوپر بند نہ کیجیے اور صاف صحیح قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا اہتمام کرکے دارین کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔

استغفار کی کثرت

چوتھا کام یہ کرنا ہے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنی ہے، حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مشہور حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر کی پہلی، دوسری اور تیسری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے "آمین" فرمایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے پوچھنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل امین علیہ الصلاۃ والسلام میرے سامنے آئے تھے اور جب میں نے منبر کے پہلے زینے پر قدم رکھا تو انھوں نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس نے رمضان المبارک کا مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی، میں نے کہا آمین (مستدرک حاکم ۴/ ۱۷۰، کتاب البر والصلۃ) ظاہر ہے کہ اس شخص کی ہلاکت میں کیا شبہ ہے جس کے لیے حضرت

جبرئیل علیہ السلام بددعا کریں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آمین کہیں، اس لیے اس مبارک مہینے میں نہایت کثرت کے ساتھ گڑگڑا کر اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کرے۔

دعا کا اہتمام

رمضان المبارک کی برکات کو حاصل کرنے کے لیے دعاؤں کا اہتمام بھی لازم ہے، بہت سی روایات میں روزے دار کی دعا کے قبول ہونے کی بشارت دی گئی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثَلٰثَةٌ لَا تُرَدُّ دَعْوَتُهُمْ اَلصَّائِمُ حَتّٰى يُفْطِرَ (الترمذی ح۳۵۹۸) تین آدمیوں کی دعا رد نہیں ہوتی (ضرور قبول ہوتی ہے) ایک روزے دار کی افطار کے وقت۔

صدقات کی کثرت

رمضان المبارک میں نفلی صدقات بھی زیادہ سے زیادہ دینے کی کوشش کرنی چاہیے، حدیث شریف میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا دریا پورے سال ہی موجزن رہتا تھا، لیکن ماہِ رمضان المبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت ایسی ہوتی تھی جیسے جھونکے مارتی ہوئی ہوائیں چلتی ہیں، جو شخص بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا اس کو ضرور نوازتے، لہٰذا ہم کو بھی اس بابرکت مہینے میں اس سنت پر عمل کرتے ہوئے صدقات کی کثرت کرنی چاہیے۔

گناہوں سے پرہیز

رمضان المبارک میں خاص طور پر گناہوں سے پرہیز کرنا نہایت ضروری ہے، ہر مومن کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ اس برکت ورحمت اور مغفرت کے مہینے میں آنکھ، کان اور زبان غلط استعمال نہیں ہوگی، جھوٹ، غیبت، چغل خوری اور فضول باتوں سے مکمل پرہیز کرے، یہ کیا روزہ ہوا کہ روزہ رکھ کر ٹیلی ویژن کھول کر بیٹھ گئے اور فحش وگندی فلموں سے وقت گزاری ہو رہی ہے، کھانا، پینا اور جماع جو حلال تھیں ان سے تو اجتناب کر لیا لیکن مجلسوں میں بیٹھ کر کسی کی غیبت ہو رہی ہے، چغل خوری ہو رہی ہے، جھوٹے لطیفے بیان ہو رہے ہیں، اس طرح روزے کی برکات جاتی رہتی ہیں، ایک حدیث شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ وَرُبَّ قَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ قِيَامِهٖ اِلَّا السَّهْرُ (سنن ابن ماجہ ح۱۶۹۰) بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے ہیں کہ ان کو روزے کے ثمرات میں سے بھوکا رہنے کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، اور بہت سے شب بیدار ایسے ہیں کہ ان کو رات کے جاگنے (کی مشقت) کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اس حدیث شریف کا مدعا یہ ہے کہ روزے کا مقصد (تقویٰ) اور رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں کے حصول کے لیے معصیات ومنکرات سے پرہیز نہایت ضروری ہے، اس کے بغیر تقویٰ کی سعادت سے متمتع نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے ان تمام باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، رمضان المبارک کی قدردانی کی توفیق بخشے اور اس بابرکت مہینے کے اوقات کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق نصیب فرمائے، آمین ثم آمین یارب العالمین!

پروفیسر ظاہر گل
بام خیل

روح پرور تقریب

معہد الصدیق کے جلسہ دستار بندی کا آنکھوں دیکھا منظر

خالق کائنات رب مازال ومالم یزل نے جب انسانوں کی یہ بستی بسائی تو جہاں ان کے لیے بے شمار نعمتوں کا انتخاب وسامان کیا تو وہاں ان کی ہدایت کا بھی بندوبست کیا، اس مقصد کے لیے نبوت کا سلسلہ چلایا اور علوم نبوت کو ختم نبوت کے صدقے ہدایت کے مراکز یعنی مدارس میں جمع کیا ، ان مدارس کی ایک کڑی معہد الصدیق للدراسات الاسلامیۃ بھی ہے، ۱۶ اپریل ۲۰۱۷ء کو معہد الصدیق کا سالانہ جلسہ دستار بندی منعقد ہوا، جس میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی، اس کا آنکھوں دیکھا حال پروفیسر ظاہر گل صاحب نے نہایت شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے چاہے وہ کسی بھی میدان میں ہو لیکن اگر یہ علم وادب، تعلیم وتعلم، عرفان وتصوف، تحقیق وتحریر، تقریر وتنقید کے میدان میں ہو اور ایک دفعہ پھر وہ باغ غنچوں، گلابوں اور دوسرے رنگا رنگ خوشبودار پھولوں سے مہک اٹھے جو ایک عرصہ سے خاموش بے بو، بے رنگ رہا ہو تو بے اختیار دل سے واہ اور زبان سے شکر اور اور چہرے پر تبسم، خوشی اور مہک کے تاثرات نمودار ہوتے ہیں اور اس شخصیت کے لیے دعائیہ الفاظ بے ساختہ نکلتے ہیں جنہوں نے کئی سالوں کی آبیاری سے اس چمن میں خوبصورت کارآمد، خوشبودار پھول اگائے ہیں۔

بام خیل کی آج کی یہ نہ بھولنے والی صبح مجھے ہمیشہ یاد رہے گی، بام خیل نام کے ساتھ نصف صدی سے جو جڑی ہوئی ادب ہے وہ علم وعرفان کا تصوف کا اور قران سے محبت کا سننے میں آیا ہے لیکن جب کبھی اس طرف نظر دوڑائی تو کچھ نظر آیا نہیں، لیکن آج صبح ہماری یہ آرزو پوری ہوگئی، آسمان پر گرمی کی شدت کو کم کرنے کے لیے بادل موجود تھے رات کی بارش سے موسم میں خنکی در آئی تھی، اپنے بھائی شاید گل اور فرینڈز آف بام خیل کے ممبر آصف خان کے ساتھ جیسے ہم نے سڑک پر قدم رکھا تو لوگوں کے تمتماتے نورانی چہروں، سفید اور صاف وشفاف، اجلے کپڑوں اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے معہد الصدیق کی جانب گامزن تھے فوراً یہ یقین ہوا کہ آج بادشاہ عبدالرؤف صاحب کی محنت رنگ لائی ہے۔

ہر طرف ایک نورانی ماحول بنا ہوا تھا مستعد طلباء اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھائے ہوئے مسکراتے باادب چہروں کے ساتھ

لوگوں کے استقبال کے لیے کھڑے تھے، مدرسہ کی انتظامیہ نے ٹریفک کو رواں رکھنے کے لیے اور لوگوں کی گاڑیوں کی حفاظت کے لیے باقاعدہ ایک نظام کے تحت ایک عارضی پارکنگ بنائی تھی۔

آج کا دن اس مدرسے کے لیے، اس گاؤں کے لیے، اس علاقے کے لیے، ان اساتذہ کے لیے، ان طلباء کے لیے اور خصوصی طور پر مولانا عبدالرؤف بادشاہ صاحب کے لیے کسی خواب سے کم نہ تھا کیونکہ آج کے دن ان سب کی مرادیں پوری ہونے والی تھی، طلباء کو اسناد اور دستار بندی باندھی جارہی تھیں، اساتذہ ہر کسی سے مبارکبادیں وصول کررہا تھا، لیکن عبدالرؤف بادشاہ کے لیے یہ دن، یہ لمحات، یہ گھڑی ایک اور طرح سے اہمیت کی حامل تھی آج اس کم عمر، ناتجربہ کار اکیلے نوجوان نے حالات کے مخالف سمت میں جو سفر مشکل اپنے لیے منتخب کیا تھا وہ لاکھوں مشکلات، آزمائشوں اور رکاوٹوں کے باوجود اپنی منزل پر آکر رک گیا ہے اور رکا بھی نہیں بلکہ اور منزلوں کی طرف گامزن ہونے کے لیے تیار ہے۔

آج سوچوں، یادوں اور خیالات کے ایک بہاؤ کے ساتھ ہی یہ ناتواں لڑکا اپنے بہت ہی اعلیٰ وارفع صوفیاء اکابرین اور اپنے خاندان کے سامنے باادب کھڑا ہے اور وہی خاندان کے بزرگ جو اپنی دینی مذہبی، اخلاقی، سماجی اور طبی خدمات کے لیے پورے علاقے میں مشہور تھے، آج اپنے فرزند ارجمند کو دین کے اس جھنڈے کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہوئے فخر محسوس کررہے تھے، اور اس خانوادے کو وہ اپنے ہاتھوں سے دستار فضیلت پہنا رہے تھے۔

آج اسے یہ محسوس ہورہا تھا، جیسے اس کے بڑے اس کے اس کام سے خوش ہوکر اس کے بنائے ہوئے اس پررونق محفل میں تشریف لائے ہیں اور ہر لفظ ہر قدم اور ہر کام پر اس کی تعریف کررہے ہیں، اپنے سر کو جھٹکا دے کر بادشاہ صاحب نے بڑے پرتپاک انداز سے فرینڈز آف بام خیل کے پرگروام میں خوش آمدید کہا۔

مقررہ وقت پر پروگرام شروع ہوا، پورا ہال، صحن اور صحن کے ساتھ ملحقہ جگہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، وقفے وقفے سے بادشاہ صاحب مہمانوں کو خوش آمدید کیلئے پنڈال سے نکل کر خود منتخب نشستوں پر پہنچاتے اور پھر پروگرام میں شامل ہوجاتے۔

آج اس روح پرور مجلس پر ہر طرف سے انوارات کی بارش ہورہی تھی، وقفے وقفے سے تقاریر لوگوں کی توجہ حاصل کررہے تھے، نعت خوان حضرات اپنی خوش الحانی سے محفل کو گرمارہے تھے، حضور پاک ﷺ کے نام کے ساتھ ہی ﷺ اور مدینے کی ذکر آتے ہی لوگوں کے دلوں میں جذبات کا سمندر ایک انگڑائے لینے لگتا، اور ہر کسی کی خواہش تھی کہ وہ ان جذبات کے ساتھ حضور پاک ﷺ کے شہر مدینہ میں حاضر ہوجائے۔

محفل اپنی عروج پر تھی اکوڑہ خٹک سے حقانیہ مدرسہ کے بزرگ تجربہ کار اور ماہر استاد مولانا ادریس صاحب دامت برکاتہم العالیہ اپنے مخصوص انداز میں لوگوں کو علم و عالم کی فضیلتیں منفرد انداز میں بتارہے تھے، ان کا لہجہ ان کی آواز ان کے دلائل ان کے واقعات ایسے تھے جسے ہر کوئی چاہ رہا تھا کہ اس کا یہ سلسلہ فضیلت علماء ختم نہ ہو، وقت کی کمی کے باعث انہوں نے تقریر جلد ختم کی اور لوگوں کے دلوں کو جذبات سے بھروا کر اسٹیج سے اتر گئے، ایک اور حقانی عالم نے باوجود تھکاوٹ کے اس محفل میں اپنے مختصر لیکن مدلل اور جذباتی انداز میں محفل کو گرمادیا۔

سب سے اہم حصہ مدرسہ کا میزانیہ تھا، جولوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور لوگوں نے اس پر خوب گفتگو کی، کیونکہ یہ اس نوجوان کا کمال ہے کہ وہ اللہ کی مدد وفضل سے تقریباً ۵۰ لاکھ روپے سالانہ سے یہ مدرسہ چلا رہا ہے، یہ اس مرد آہن کی ہمت وطاقت اور اپنے اللہ پر بھروسہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

روح پرور وہ ساعتیں جب شروع ہوئی تو ایک الگ نظارہ نظر آیا تھا، علماء پھول جیسے بچوں کو دستاریں پہنا رہے تھے، کسی کی آنکھوں میں خوشی کی کسی کی آنکھوں میں اس سہتے مشکل لمحوں کی اور کسی کی آنکھوں میں کامیابی کی چھلکتے ہوئے آنسو صاف نظر آرہے تھے۔

بادشاہ صاحب کا عمدہ مختصر خطاب اس پروگرام کے ماتھے پر جھومر کی طرح سجا کیونکہ اس نے وہ ساری باتیں مجمع کے سامنے رکھیں جو اسے سارا سال اس باغ کی آبیاری کے وقت پیش آتی ہیں، پرنور چہرہ، خوبصورت لہجہ، مدہم آواز کے ساتھ روانی کے ساتھ بات کرتے بادشاہ صاحب نے اپنی باتیں ختم کیں تو دعا کا مرحلہ شروع ہوا، خود بادشاہ صاحب نے ایک بزرگ عالم دین کو دعا کے لیے طلب کیا جس نے بڑی عاجزی کے ساتھ دربار خداوندی میں گڑا گڑا کر اس محفل کے لیے، ان طلبا کے لیے اور ملک وقوم کے علاوہ ملت اسلامیہ کے لیے دل کی گہرائیوں سے اور چھلکتے آنسو سے دعائیں مانگیں۔

مہمان نوازی کی جذبے سرشار بادشاہ صاحب نے تمام مجمع کے لیے طعام کا انتظام کیا تھا، اس لیے سب کو درخواست کی گئی کہ کوئی بھی بندہ بغیر کھانے اس محفل سے رخصت نہ ہوگا، مستعد عملے نے تمام مہمانان کی خوب خدمت کی میری دعا ہے کہ بام خیل کی سرزمین پر اگا یہ درخت تناور وتوانا رہے اور اس سے گردوپیش کے تمام علاقے کے لوگوں کو فیض نصیب ہو، آمین

امتحانات میں نقل کرنا ایک شرعی وقانونی جرم

امانت کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بڑا تاکیدی حکم فرمایا اور مسلمانوں کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ امانت کو اپنے حقدار کے حوالہ کردیا کریں، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی مبارک زندگی میں بہت کم ایسے خطبے دئے ہیں جن میں امانت کی اہمیت اور اس کی پاسداری کرنے کی تاکید نہ فرمائی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو یہ تعلیم دیا کرتے تھے کہ جو شخص امانت کا خیال نہیں رکھتا وہ کامل مسلمان نہیں ہوسکتا۔

یادرہے کہ امانت کسی کے پاس مال رکھنے ہی کو نہیں کہا جاتا بلکہ اس لفظ کا مفہوم بڑا وسیع ہے، صرف محسوس چیزوں تک ہی نہیں بلکہ اقوال واعمال تک اس کے مفہوم میں شامل ہیں، ایک انسان پر دوسرے انسانوں کے متعلق جو کچھ حقوق وذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ سارے امانت کے مفہوم میں داخل ہیں اور قرآن وحدیث کے مندرجہ بالا ہدایات کے مطابق اس کی پابندی کرنا اور اپنے مقام تک پہنچانا ضروری ہے، امتحانی بورڈ یا متعلقہ ادارے کی طرف سے مقرر کردہ شرائط وضوابط کے مطابق امتحان دینا اور اس میں ہر قسم کے نقل وخیانت سے بچتے رہنا بھی امانت ہی کا ایک شعبہ ہے اس میں ممتحن، چپڑاسی یا خود امتحان میں شریک افراد سے کسی قسم کی مدد لینا خیانت ہے جو کہ ایک بڑا گناہ اور شرعی وقانونی جرم ہے۔

یوں تو خوفِ خدا، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کے فقدان یا کمی اور شرعی احکام ومسائل کی پاسداری کے خیال نہ کرنے کی وجہ بنیاد پر بہت پہلے سے یہ مرض ہمارے معاشرے کے بدن میں موجود چلا آرہا ہے لیکن ابھی کچھ عرصہ سے روز افزوں اضافہ جاری ہے تقریباً ہر سال امتحانات کے موقع پر اس کے نت نئے طریقے اور حیرت انگیز شکلیں سوچی پھر میدان میں بروئے کار لائی جاتی ہے گزشتہ کی طرح امسال بھی مارچ میں۔ جبکہ ہمارے قومی تعلیمی اداروں میں امتحانات کا سلسلہ جاری ہوتا ہے، یہ مرض مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا رہا۔

بہت سے لوگ تو اس کو ایک وقتی مشغلہ سمجھتے ہیں کہ کسی بات کو معلوم کرنے کی فوری ضرورت پڑی اور کسی طرح دیکھ پوچھ کر معلوم کرلیا، اگر امتحان کے نگران (سپرڈنٹ) کے نظروں میں آئے بغیر کام چلا تو کامیابی کی بات ہے ورنہ تو اس کی کچھ خوشامد کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا، اور اگر کوئی شخص زیادہ ہی نیک تو وہ دل میں اس کے ساتھ کچھ کراہت سے محسوس کرتا ہے جو رفتہ رفتہ رخصت ہوجاتا ہے حالانکہ شریعت کی نظر میں نقل کرنا نہ صرف یہ ایک گناہ ہے بلکہ کئی گناہوں اور متعدد خرابیوں کا گچھا ہے، یہاں اختصار کے ساتھ ان گناہوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

☆ یہ حکومت کے جائز اور مصلحت پر مبنی قوانین کی خلاف ورزی ہے جبکہ ایسی قوانین کی پابندی شرعاً بھی گناہ ہے۔

☆ خیانت: جیسا کہ مضمون کی ابتداء میں ذکر کیا گیا کہ ہر ذمہ داری امانت کے مفہوم میں داخل ہے اور اس کو نبھانا

ضروری ہے اس میں کوتاہی کرنا خیانت ہے، اگر امتحان دینے والا طالب علم امتحان کے دوران نقل کرے تو یہ اس کی طرف سے خیانت ہے کیونکہ اس کی ذمہ ضروری تھا کہ خاموشی اور دیانتداری کے ساتھ اپنے معلومات پرچے میں لکھ لیتا، اور اگر خدانخواستہ ممتحن یا ہال کا نگران بھی اس عمل میں اس کے ساتھ شریک ہوتا ہے تو یہ دوسرا گناہ ہے کہ امتحان دینے والوں کو نقل سے روکنا اس کی ذمہ داری تھی جس میں اس نے خیانت سے کام لیا۔

☆ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ طلبہ کی طرف سے ممتحن کے لئے نقد، یا چائے وغیرہ دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے تا کہ وہ دوران امتحان ان طلبہ کے نقل سے چشم پوشی کرتا رہے اور ان کو کوئی روک ٹوک نہ کرے، یہ لین دین رشوت میں داخل ہے جو کہ گناہ کبیرہ ہے۔

☆ بہت سی جگہوں پر نگران صاحب امتحان دینے والے طلبہ کو نقل کرنے کی اجازت دیتا ہے جبکہ گناہ کے کام کی اجازت دینا بھی گناہ ہے۔

☆ نقل کرنا گناہ ہے اور قدرت کے باوجود اس کو نہ روکنا مداہنت کہلاتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔

☆ پرچہ میں سوال کا جواب لکھنا ممتحن کے سامنے یہ بات ظاہر کرنا ہے جواب میں نے خود لکھا ہے، اب اگر نقل کے ذریعے کوئی پرچہ حل کر کے جواب لکھے تو یہ جھوٹ بھی ہے اور دھوکہ دہی بھی۔

☆ لیاقت نہ ہونے کی وجہ سے امتحان پاس کرنا یا حل شدہ پرچہ جمع کرانا بھی گناہ ہے کیونکہ یہ ایک ایسی صفت کا اظہار ہے جو حقیقت میں اس کے اندر موجود نہیں، حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: المتشبع بمالم یعط کلابس ثوبی زور "جو شخص اپنے آپ کو اس چیز کے ساتھ سیر دکھائی دے جو اس کو حاصل نہ ہو وہ ایسا ہے جیسا جھوٹ کا لباس پہننے والا"، یعنی جس طرح لباس انسان پر سرتا پا حاوی ہوتا ہے یوں ہی جھوٹ بھی ایسے شخص کو مکمل طور پر گھیر لیتا ہے۔

☆ بہت سے جگہوں کے متعلق سننے میں آتا ہے کہ کئی پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے ذمہ دار لوگ بھاری بھر رقم دیکر امتحان ہال کرایہ پر لے لیتے ہیں جس کے بعد ان کے طلبہ کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں، اس میں دیگر گناہوں کے ساتھ ساتھ ایک گناہ ناجائز معاملہ کرنے کا بھی ہے اور مال کو ناجائز مقاصد میں خرچ کرنا اسراف وتبذیر کی قبیح ترین شکل ہے جو بجائے خود مستقل گناہ ہے اور اور قرآن مجید میں تبذیر کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

☆ اس طریقہ کے مطابق امتحان دینے کے بعد مختلف اداریں اپنی اشتہارات میں پوزیشن اور امتحان میں حسن کارگردگی کی اعلان واظہار کرتی ہیں، یہ ایک غیر واقعی صفت کا اظہار بلکہ دعویٰ ہے جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

☆ نقل کرنے کی وجہ سے بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ جو طالب علم انعام وپوزیشن لینے کا مستحق ہوتا ہے اس کا حق دب جاتا ہے اور نالائق شخص نقل کرنے کی وجہ سے گویا کہ اس کا حق غصب کر لیتا ہے۔

☆ اسی نقل کے جذبہ کے تحت کتابوں اور پاکٹوں کی جو کچھ توہین وگستاخی ہوجاتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، خصوصاً اسلامیات کے پرچہ میں تو اس کے نہایت افسوسناک اور لرزناک مظاہر سامنے آتے ہیں کسی قومی تعلیمی ادارے کے کوڑادان سے اس کا کچھ تھوڑا سا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

☆ جو استاد امانت داری اور سچائی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے اس کو بدنام کیا جاتا ہے، طرح طرح کے الزامات لگا کر اور غیبت کر کے اس کی بے عزتی کی جاتی ہے۔

☆ کئی جگہوں خصوصاً پرائیویٹ اداروں میں میں خود ادارے کے ذمہ داران کی طرف سے اپنے شرکاء امتحان کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے اور مشکل سوالات کے حل کرنے میں کمزور ساتھیوں کی مدد کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور ایسا کرنے والوں کو سراہتے اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو کہ بالکل ناجائز اور گناہ کی بات ہے۔

☆ آس پاس بیٹھے ہوئے شرکاء امتحان کے سامنے ایسی خیانت کی جائے تو معصیت کا اظہار واعلان ہے جو بڑی خطرناک بات ہے۔

☆ اس عمل سے قوم وملت کا جو کچھ عظیم نقصان ہوتا ہے وہ کسی ذی شعور انسان سے مخفی نہیں ہوسکتا، نا اہل لوگ نقل وخیانت کے ذریعے ڈگری حاصل کر کے مختلف عہدوں پر براجمان ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے ماتحت اداریں عضو معطل ہوکر رہ جاتے ہیں، وطن عزیز پاکستان میں اس کی مثالیں کچھ کم نہیں ہیں۔

☆ گناہ کرنا اگرچہ بڑی خطرناک بات ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ خطرناک بات یہ ہوتی ہے کہ انسان گناہ کو گناہ نہ سمجھے، یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے نتیجہ میں بسا اوقات ایمان رخصت ہوجانے کا بھی خدشہ ہوتا ہے، امتحان میں نقل کرنا اگرچہ گناہ بلکہ کئی ایک کبائر کا سرچشمہ ہے مگر سب سے بڑھ کر خطرے کی بات یہ ہے کہ کوئی اس کو سمجھنے کے لئے بھی تیار نہیں بلکہ مختلف حیلوں اور بہانوں کے ذریعے اس کے جواز کے لئے جواز کا راستہ فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بہت سے لوگ اچھے خاصے دیندار اور دیانتدار ہوتے ہیں اور وہ ٹھیک طرح اپنی ڈیوٹی بھی کر رہے ہوتے ہیں لیکن بسا اوقات وہ اس لئے ہمت ہار جاتے ہیں کہ دیگر لوگ نقل کرتے ہیں تو اگر ہم نقل نہیں کریں گے تو نمبر کم آئیں گے اور بدنامی ہوگی، یاد رہے یہ کوئی عذر نہیں ہے، نہ شریعت کی نظر میں اس کا اعتبار ہے نہ ہی عقل سلیم اس کو تسلیم کرتی ہے، معاشرے میں منفی کام کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی اگر ہر کوئی شخص ان کی دیکھا دیکھی اس طرح ہمت ہارتا جائے اور عقل ودانش کو بالائے طاق رکھ کر اس منفی کردار کا حصہ بنتا جائے تو معاشرے کی جو کچھ شکل بنے گی اس کا تصور بھی اندوہناک وعبرتناک ہے۔

اسی طرح بہت سے دین دار لوگ بعض خاص مضامین کے امتحانات میں نقل کرنے کے لئے یہ بہانہ اختیار کرتے ہیں کہ یہ مضمون چونکہ غلط یا غیر ضروری ہے اس لئے ہم نقل کرتے ہیں مثلاً انگریزی کے مضمون میں نقل کرنے کے لئے بعض دفعہ یہ سہارا لیا جاتا ہے، اس کی حیثیت بھی عذر لنگ سے کچھ زیادہ نہیں ہے، جن امور کی وجہ سے نقل کرنے کو حرام کہا جاتا ہے، وہ تمام امور ہر مضمون میں نقل کرنے کے اندر موجود ہوتے ہیں، خیانت بہر حال خیانت ہے چاہے وہ اردو وعربی میں انگلش وہندی میں۔

تمام باتوں کا حاصل یہ ہے کہ امتحانات میں نقل کرنا دینی وعقلی، قانونی اور اخلاقی ہر لحاظ سے ایک جرم اور نہایت قبیح حرکت ہے، جس سے خود بچنا اور اپنے حلقہ اثر کو بچانے کی بھرپور کوشش کرنا عقل اور وقت کا تقاضا ہے، ارباب اختیار، ممتحنین اور متعلقہ اداروں اور ان کے ذمہ دار حضرات کی خدمت میں عاجزانہ گزارش ہے کہ وہ اپنی استطاعت کی حد تک اس مرض کو روکنے کی اپنی بساط بھر کوشش کریں، ورنہ تو یہ صرف آخرت ہی کا نقصان نہیں بلکہ مادی دنیا میں بھی اقتصادی، سیاسی، عسکری وغیرہ مختلف سطح پر ملک کے کمزوری، کھوکھلا پن اور بدنامی کا باعث ہے، اللہ تعالیٰ عقل سلیم اور عمل کی توفیق نصیب فرمائیں۔

مولانا محمد اسماعیل حقانی
مدرس معہد ہذا

احوال وکوائف

تقریری مقابلہ کا انعقاد

بزم شیخ الہند کے عنوان سے گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی معہد الصدیق میں تقریری مقابلہ کا انعقاد کیا گیا، جس میں مختلف درجات کے مقررین ہونہار طلبا نے حصہ لیا، یہ مقابلہ معہد الصدیق کے مرکزی مسجد میں منعقد ہوا، اس مجلس کے مہمان خصوصی مولانا سجاد الحجابی حفظہ اللہ تھے اور منصفین کرام میں مولانا عبد الماجد، مولانا نیک زادہ اور مولانا مراد علی شامل تھیں، نظامت کے فرائض درجہ سادسہ کے طالب علم محمد نصیر نے انجام دی، تقریر کے لیے پانچ سے سات منٹ تک کا دورانیہ مقرر کیا گیا تھا، تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا، تقریروں کے دروان اسٹیج سیکرٹری اپنے مسحور کن انداز سے سامعین کو محظوظ کرتے رہے، اس موقع پر مقامی اور مہمان علماء کرام کی ایک معتدبہ تعداد بڑے شوق اور رغبت کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے، مقررین طلباء کے بیانات کے بعد معہد کے روح رواں مولانا عبد الرؤف بادشاہ مدظلہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور مہمان خصوصی کو خطاب کے لیے دعوت دی، بیان ختم ہونے کے بعد مولانا نیک زادہ کو نتائج سنانے کے لیے دعوت دی گئی، انہوں نے پہلے معہد الصدیق کے اساتذہ اور طلباء کی محنت اور مساعی کو سراہا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے نتیجہ بیان فرمایا، آخر میں مفتی عابد وہاب صاحب دامت برکاتہم کی دعا پر یہ خوبصورت بزم اختتام پذیر ہوئی۔

اختتام اسباق

معہد الصدیق کے شعبہ درس نظامی میں تعلیمی سال کا اختتام حسب معمول معہد کے نگران مولانا عبد الرؤف بادشاہ مدظلہ کے رقت انگیز دعا سے ہوئی، اس موقع پر معہد کے طلباء، اساتذہ کرام اور امت مسلمہ کے لیے خصوصی دعا کی گئی۔

جلسہ دستار بندی

۱۶ اپریل کو ختم مشکوۃ شریف اور حفاظ کی دستار بندی کی تقریب منعقد ہوئی، جسمیں درجہ موقوف علیہ کی ۱۰ طلباء اور حفظ وناظرہ کی ۳۲ طلباء کی دستار بندی کی گئی، تقریب کے مہمان خصوصی شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس صاحب تھے، تقریب کا آغاز درجہ ثانیہ کے طالب علم قاری اعزاز احمد کی تلاوت سے ہوا، نظامت کے فرائض مولانا مقصود علی صاحب نے انجام دیے، مدرسہ کا سالانہ گوشوارہ اور تعلیمی احوال مدرس معہد مولانا ناصر خان حقانی نے بیان کیے، معہد کے روح رواں مولانا عبد الرؤف بادشاہ مدظلہ نے مہمان خصوصی اور آئے ہوئے معزز

علماء کرام اور عوام الناس کا شکریہ ادا کیا، پیر طریقت مولانا حزب اللہ جان صاحب کی رقت آمیز پرسوز دعا سے یہ پروقار تقریب اختتام پذیر ہوئی، اس موقع پر جملہ اساتذہ جامعہ کے علاوہ علاقہ کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے معزز علماء کرام اور کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔

سالانہ امتحان کا انعقاد

معہد الصدیق میں حسب روایت سالانہ امتحان کا انعقاد کیا گیا، غیر وفاقی درجات کے امتحان آغاز ۱۵ اپریل سے کیا گیا، جو کہ ۲۰ اپریل تک جاری رہا، اور وفاقی طلباء کرام کا امتحان ۲۲ اپریل بروز ہفتہ سے ۲۷ اپریل بروز جمعرات تک جاری رہا، معہد الصدیق امتحانات وفاق کا سنٹر ہے جس میں دور دراز کے طلباء نے بھی شرکت کی، امتحانات میں سخت نگرانی کا التزام کیا گیا، تمام امتحانات نہایت پرسکون و پراطمینان ماحول میں بعافیت منعقد ہوئے، امتحانات کے مکمل ہونے کے بعد ہی سالانہ تعطیلات کا بھی آغاز ہو گیا۔

دورہ صرف ونحو

سالانہ تعطیلات کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے مختصر دورانیے کے دوروں کی جو روایت چل نکلی ہے، وہ بہت مستحسن، مفید اور نتیجہ خیز ہے، اسی روایت کے پیش نظر معہد الصدیق میں دورہ صرف ونحو کا انعقاد کیا گیا ہے جو رمضان المبارک تک جاری رہے گی، دورہ پڑھانے کے لیے مفتی فضل غنی صاحب اور مولانا مقصود علی صاحب (مدرسین معہد) کا انتخاب کیا گیا، دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس دورہ کو نافع بنائیں۔

حضرت مولانا عبدالرؤف بادشاہ صاحب کا سفر عمرہ

۳۱ مئی بروز بدھ حضرت مولانا عبدالرؤف بادشاہ صاحب (مدیر مسئول) ادائیگی عمرہ کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے، اللہ تعالی ان کا یہ مبارک سفر آسان کرے اور عمرہ قبول فرمائے۔

مبصر کے قلم سے

کتاب شناسی

دارالعلوم حقانیہ اور رد قادیانیت

ترتیب وتدوین: مولانا انعام الرحمن شانگلوی، مولانا محمد اسرار مدنی

باہتمام ونگرانی: مولانا سمیع الحق مدظلہ ضخامت: ۶۰۶ صفحات

ناشر: مؤتمر المصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

استعماری قوتوں اور اسلام دشمن لابیوں نے امت مسلمہ کی وحدت وسالمیت، نظریاتی یکجہتی اور سیاسی قوت کو ختم کرنے کے لیے جو حربے استعمال کیے، اس میں فتنہ قادیانیت سب سے نمایاں ہے، جس کی بنیاد ننگ ملت، غدار دین مرزا غلام احمد قادیانی نے رکھی، جس کو برطانوی سامراج نے آب ودانہ مہیا کیا اور یہودی آقاؤں نے پروان چڑھایا، مرزا قادیانی نے مصلح، مجدد، مہدی، مسیح موعود، نبی رسول، موعود اقوام عالم جیسے متضاد، متفرق دعوؤں کا ملغوبہ تیار کر کے اپنی ذات کو اس کے گرد گھمایا، اس فتنہ کا سب سے بڑا نشانہ دین اسلام کا بنیادی عقیدہ ختم نبوت تھا، جس کی آڑ میں انہوں نے سید الکائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات بابرکات کی توہین وتحقیر میں کوئی کسر نہ چھوڑی، ایک طرف اس فتنہ کی سنگینی، مگر دوسری طرف مسلمانوں کے حساس، عاقبت اندیش اور عشق رسول ﷺ سے سرشار قائدین جن کو اللہ تعالیٰ نے فتنہ مرزائیت کے بارے میں دل بینا اور شرح صدر سے نوازا تھا۔

ہزاروں علماء، مفکرین، زعماء، مصنفین، مناظر، صحافی، مبلغ اور لاکھوں عوام ان سارقین تارج وتخت ختم نبوت کا محاسبہ اور تعاقب کرنے کے لیے میدان جہاد میں کود پڑے، اور خواجہ یثرب ﷺ کی ناموس ختم نبوت کے لیے اپنی زندگیاں تج دیں، جبکہ کئی سعادت منداس راہ میں کٹ مر کر بھی خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے اور شفاعت آقائے دوجہاں ﷺ اور خوشنودی اولین وآخرین کی ابدی سعادت سے مالا مال ہوئے، دیگر مجاہدین ختم نبوت کی طرح اس تحریک میں جامعہ دارالعلوم حقانیہ اور قائد شریعت شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کا بھی بنیادی کردار رہا، تحریک ختم نبوت میں جامعہ حقانیہ کا کردار، تعاقب قادیانیت میں جامعہ کے مساعی جمیلہ خود ایک طویل داستان ہے، جو سنہری حروف سے لکھی گئی اور لکھی جارہی ہے۔

اس تمام جدوجہد میں ماہنامہ ''الحق'' نے بھی کلیدی کردار ادا کیا، اس پچاس سالہ جدوجہد پر مشتمل کتاب ''دارالعلوم حقانیہ اور رد قادیانیت'' ہے جس میں اس شجرہ خبیثہ کے ہر ہر پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے اور جامعہ کے کردار کو اجاگر کیا ہے، یہ کتاب ارباب علم ودانش اور اصحاب تحقیق وریسرچ کے لیے یہ ایک بیش بہا خزانہ ہے، اس کا ایک اہم حصہ قادیانیت کے بارہ میں پارلیمنٹ میں آئینی اور دستوری جدوجہد سے متعلق ہے، جو یہ نشاندہی کرتا ہے، کہ قادیانیوں کے بارہ میں یہ اقدامات وقتی ہیجان اور

جذبات پر مبنی نہیں بلکہ دنیا میں رائج دستوری اور آئینی تقاضوں کے مطابق ہے، دارالعلوم حقانیہ کو اللہ تعالیٰ نے علم و تعلیم، تدریس و دعوت، سیاست و جہاد کے ہر ہر شعبہ میں خصوصی فضل و کرم سے نوازا ہے، تمام فرق باطلہ پرویزیت، انکار حدیث، تجدد و استشراق، الحاد و بدعات جیسے فتنے اس کے باطل شکن حملوں سے نہیں بچے، تو قادیانیت جیسا ام الفتن فتنہ کب نظر انداز کرتا ہے اس فتنے کے تعاقب میں بھی جامعہ حقانیہ نے اہم کردار ادا کیا، دارالعلوم حقانیہ کے دو اصحاب علم و فضل تلامذہ مولانا انعام الرحمن شانگلوی (مدرس جامعہ تحسین القران) اور مولانا محمد اسرار مدنی (مدرس دارالعلوم حقانیہ) نے بڑی محنت، عرق ریزی، نفاست اور جامعیت کے ساتھ یہ کارنامہ انجام دیا، اللہ کرے یہ ان کے علمی تصنیفی خدمات کا بہترین آغاز ثابت ہو، اللہ تعالیٰ اس عجالہ نافعہ کو پوری امت کے افادہ اور استفادہ کا ذریعہ بنائے۔ (مفتی محمد انس حقانی)

فداک امی و ابی یا رسول اللہ!

تالیف: محترمہ ام عماد ضخامت ۲ جلد ۹۱۰ صفحات

سیرت النبی ﷺ پر بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں دنیا کے مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور لکھنے والوں میں صرف مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں شامل ہے، سیرت نبوی ﷺ پر لکھنے کا یہ سلسلہ صرف آج کی بات نہیں، خیر القرون کے زمانے میں سیرت نبوی ﷺ کے مدون ہونے کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب قرآن و حدیث کے محفوظ ہونے کا سب کو اطمینان ہوا تب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سیرت نبوی ﷺ پر اپنی توجہات مرکوز فرمائی، اس طرح حضور ﷺ کے وفات کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد سیرت نبوی ﷺ مدون ہونے کا کام شروع ہوا، تا ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے عرب و عجم میں سیرت پر لکھنے جانے والی کتابوں کی تعداد لامحدود ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں سیرت پاک پر بہت سے عباقرہ اور اہل علم نے خامہ فرسائی فرمائی ہیں جس میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلمان ندوی، علامہ سلمان منصور پوری، مولانا عبدالرؤف دانا پوری، مولانا محمد میاں، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا ابوالحسن ندوی وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ بہت سے اہل علم نے اس موضوع پر کام کیا اور کر رہے ہیں، تاہم معروف ادیب و شاعر جناب ماہر القادری کو ناول کے انداز میں ''دریتیم'' لکھنے کا اعزاز حاصل ہے، شاید اسی منہج کے دیگر بھی سیرت کی کتابیں موجود ہو، عربی زبان میں یہ اعزاز محمد حسین ہیکل کو حاصل ہے، زیر تبصرہ کتاب فداک امی و ابی یا رسول اللہ ابھی اس سلسلہ کی ایک حسین کڑی ہے، جس میں نہ مقدمہ ہے، نہ فہرست، نہ عنوانات ہے نہ ناشر کی پہچان، تاہم انداز تحریر میں اتنی جاذبیت ہے کہ جس سے قلب کو تسکین اور روح کو چین حاصل ہوتا ہے، تحریر میں ایسی روانی ہے کہ قاری پڑھتے ہی روحانی غذا حاصل کرتا چلا جاتا ہے، گئے دور کے ایسے نقشے کھنچتے چلے جاتے ہیں کہ قاری خود کو وہیں محسوس کرتا ہے جہاں نوک قلم سے جواہر پارے نکل رہے ہوتے ہیں، محترمہ ام عماد صاحبہ سرورق پر لکھتی ہے

> ''یہ سیرت پر کوئی باقاعدہ تحریر نہیں صرف اتنی کوشش کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دلکش زندگی کے کچھ دلآویز حصے اپنے اور آپ کے سامنے پیش کیے جائیں، کہ جن کو پڑھ کر ہم سب کے اندر رسول اللہ ﷺ کی محبت میں اضافہ ہو اور ہم بھی ایسی ہی زندگی گذارنے کی کوشش کرے''

کتاب میں ۱۵ ابواب ہیں اور ہر باب جب کھولتے ہیں تو تاریخ نبوت کے دریچوں سے نئے عنوان رقم ہونے لگتے ہیں، اللہ کریم محترمہ ام عماد صاحبہ کی عمر میں برکت، قلم میں مزید روانی، تحریر میں چاشنی، قلب میں ذوق وجدانی مزید افزوں کرے تا کہ

اس دور میں لوگوں میں کیفیت ہیجانی ختم اور شعور ایمانی میں اضافہ ہو، اور صحیح تاریخ کی ورق گردانی میں جاں فشانی کا ازدیاد نصیب فرمائے، کتاب کی طباعت، کاغذ اور جلد بندی عمدہ اور معیاری ہے، سیرت نبوی ﷺ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یقیناً یہ کاوش ایک بہترین سوغات اور انمول تحفہ ہے (مولانا محمد اسلام حقانی)

انبیاء کے دیس میں

رشحات قلم شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ مدنیؒ

مرتب: مفتی محمد انس حقانی ضخامت: ۱۹۲ صفحات

ناشر فیضان اکیڈمی بام خیل، صوابی

سفرنامہ ادبیات کا ایک اہم صنف ہے جو ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کرواتا ہے، جو ایک سیاح اپنے مشاہدات، تجربات دوران سفر قلمبند کرتا ہے، سفرنامے کا اصل موضوع فرد، معاشرت اور تمدن کے حرکیات ہوتی ہے جس کو بشریاتی زندگی کہتے ہیں سفرنامے کی تاریخ بہت پرانی ہے، تاہم اردو ادب میں سفرنامے کا آغاز یوسف کمبل پوش نے کیا، انہوں نے پہلا سفرنامہ ''سفرنامہ عجائبات فرنگ'' کے نام سے لکھا، اسکے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا، رفتہ رفتہ مصنفین اور قلم کاروں نے مختلف قسم کے سفرنامے لکھنے شروع کی، استاد مکرم شیخ المشائخ ڈاکٹر سید شیر علی شاہ مدنیؒ نے بھی جب سفر عرب کیا تو انہوں نے اپنا روداد سفر ماہنامہ الحق میں لکھنا شروع کیا جسے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، شیخ مدنیؒ نے عرب کے مختلف ممالک کے اس سفر کو نہایت ہی سلیقے اور اعلیٰ قرینے سے لکھا، ان کی قلم کی رنگینی اور دلچسپی کا سب سے بڑا مظہر ان کا یہ سفرنامہ ہی ہے جو ''ماہنامہ الحق'' کے صفحات کی زینت بن چکی ہے۔

مولانا انس حقانی نے الحق کے صفحات اور دیگر مختلف مراجع سے جمع کر کے اسے مرتب کیا اور کتابی صورت میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کی، یہ کتاب دیار عرب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک انمول تحفہ سے کم نہیں، اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث مولانا شیر علی شاہ مدنیؒ کے درجات عالیہ کا وسیلہ بنائے اور مولانا انس حقانی کو مزید تصنیفی خدمات سے نوازے اور اس کتاب کو قبولیت عامہ نصیب فرمائے۔ (مفتی منفعت احمد)

ملفوظات شیخ الحدیث ڈاکٹر شیر علی شاہ مدنیؒ

مرتب: مفتی محمد انس حقانی ضخامت ۲۴۰ صفحات ناشر: مؤتمر المصنفین جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

ضلع صوابی ایک مردم خیز خطہ ہے خدمت دین کے ہر میدان میں یہاں کے اہل علم کی خدمات عیاں ہے، تدریس کا میدان ہو یا تبلیغ کا، تقریر کا میدان ہو یا تحریر کا، ہر میدان کے شہسوار یہاں پائے جاتے ہیں، تصنیف و تالیف کے بہت سے شہسوار اس میدان عمل میں ایک سے ایک بڑھ کر خدمات انجام دیتے رہتے ہیں، اس ضلع میں مصنفین کا ایک وسیع حلقہ وجود میں آچکا ہے، اس میں نو وارد مؤلفین کا بھی بہت بڑا اور اہم رول ہے، ان نو وارد مؤلفین میں ایک نیا نام مولانا مفتی محمد انس حقانی کا بھی ہے، مولانا انس حقانی جامعہ دار العلوم حقانیہ کے ہونہار فاضل، جامعہ ابو ہریرہ کے متخصص، معہد الصدیق بام خیل صوابی کے مدرس ہیں، شیخ المشائخ مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ مدنی نور اللہ مرقدہ کے تلمیذ خاص ہونے کا شرف بھی انہیں حاصل ہے، تلمیذ خاص اس لئے کہ انہیں شیخ مدنی سے بے پناہ محبت ہیں اور

اسی محبت اور عقیدت کی بنیاد پر انہوں نے ''مجالس شیخ'' مرتب کی اور شیخ مدنی کے افادات کو اس مختصر سی کتابچے میں سمو دینے کی سعی کی ہے، یہ حضرت شیخ سے انکی عقیدت ومحبت کی روشن دلیل ہے۔

یہ کتاب مفتی انس حقانی کا نقش اول تھا تاہم ان کا یہ نقش اول بہت سے نقوش کا پیش خیمہ ثابت ہوا، مولانا انس حقانی تصنیف وتالیف کا خاص ذوق رکھتے ہیں انہوں اس کے علاوہ ''جدیدیت: تعارف واثرات'' نامی کتاب بھی مرتب کی ہے اور شیخ القران والحدیث مولانا حمداللہ جان ڈاگی مدظلہ کے افادات کو بھی مرتب کر چکے ہیں اس کے علاوہ اور بھی کتابیں زیر طبع ہے ''مجالس شیخ'' کے بعد انہوں نے ملفوظات ڈاکٹر شیر علی شاہ مدنی کو مرتب کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کتاب کو انہوں نے حضرت شیخ مدنی کی تحریروں اور شیخ کے متعلق لکھی گئی کتابوں سے مرتب کیا ہے، بہر حال ملفوظات شیخ مدنی مولانا مفتی انس حقانی کی پیش قیمت اور قابل قدر تصنیفات کی ایک حسین کڑی ہے اور نہایت قابلِ قدر کاوش ہے، ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس مختصر وقت میں بامقصد کتابیں مرتب کر کے لائق صد تحسین کام کیا، شیخ مدنیؒ کے افادات وملفوظات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی سوغات سے کم نہیں، اللہ کرے کہ انہوں نے جن جن مقاصد کے حصول کے لیے اپنا قلم اور قدم اٹھایا ہے، اس میں کامیابی سے ہمکنار کردے۔ (مولانا مفتی راحت نیاز حقانی)

معرفۃ السنن اردو شرح آثار السنن

تالیف: مولانا ابو محمد بہار علی صاحب ضخامت: ۴۰۰ صفحات

ناشر مکتبہ ابن عباس اندرون مدرسہ ابن عباس تخت بھائی مردان

درس نظامی میں شامل علامہ نیمویؒ کی کتاب ''آثار السنن'' ایک اہم کتاب ہے جو اہل علم کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اس اہم اور نافع کتاب کی کئی شروحات منظر عام پر آچکی ہے اس سلسلہ کی اہم اور حسین کڑی مولانا بہار علی صاحب کی کتاب معرفۃ السنن شرح اثار السنن بھی ہے، مولانا بہار علی ایک جید مدرس، صاحب طرز مصنف ہیں، مدرسہ ابن عباس تخت بھائی میں اپنی تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس شرح میں انہوں نے جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ آثار السنن میں مذکور احادیث کی عام فہم ترجمہ، نافع تشریح، اختلاف ائمہ کی نافع مباحث نہایت ہی اعلیٰ سلیقے سے بیان کی ہے، کتاب کے آخر میں اثار السنن میں مذکور راویوں کی تفصیلات بھی پیش کی ہے، طلبہ حدیث کے لیے یہ کتاب ایک گلدستہ سے کم نہیں، اللہ مولانا کے مساعی جمیلہ کو قبولیت سے نوازے، آمین

درسی تقریر ہدایۃ النحو

افادات شیخ الصرف والنحو مولانا محمد قاسم صاحب

تالیف: مولانا ابو محمد بہار علی صاحب ضخامت: ۳۲۵ صفحات

ناشر مکتبہ ابن عباس اندرون مدرسہ ابن عباس تخت بھائی مردان

علم النحو میں ہدایۃ النحو ایک اہم کتاب ہے اس کی اہمیت اہل علم سے مخفی نہیں، عرصہ سے درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے

اور درجہ ثانیہ کے طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے، مختلف زبانوں میں اس کی لاتعداد شروحات موجود ہے اور اب بھی اس کی شروحات لکھی جارہی ہے، شروحات کے علاوہ اس فن کے ماہرین واساتذہ کی تقریریں بھی نوٹ کی جاتی ہے، اس سلسلہ کی ایک حسین کڑی مولانا بہار علی صاحب کی مرتب کردہ کتاب ''درسی تقریر ہدایۃ النحو'' بھی ہے، جو مولانا محمد قاسم صاحب کے درسی افادات پر مشتمل ہے کتاب کی خصوصیات میں عبارت پر مکمل اعراب، عبارت کا بامحاور آسان ترجمہ، مختصر اور جامع تشریح، اشعار کی نحوی ترکیب اور دیگر فوائد نافعہ قابل ذکر ہیں، مولانا بہار علی خود بھی ایک جید مدرس اور صاحب ذوق عالم ہیں، اس کے علاوہ اس کی دیگر کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہے، یہ کتاب علم النحو کے طلبہ وطلباء کے لیے ایک قیمتی سوغات اور انمول تحفہ ہے اللہ اسے قبولیت عامہ سے نوازے اور مرتب کو مزید بھی خدمات کے توفیق عطا فرمائے۔

محبت نبوی ﷺ

مؤلف: سید عزیز الرحمن صفحات ۷۲: قیمت: ۳۰ روپے ناشر: زوار اکیڈمی پبلی کیشنز کراچی

مولانا سید عزیز الرحمن صاحب جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، سیرت نبوی ﷺ کے حوالہ سے ایک اعلی مقام رکھتے ہیں، ان کے زیر نگرانی زوار اکیڈمی سے سیرت نبوی ﷺ کے مختلف پہلو پر ''جواہرات سیرت'' کے نام سے سلسلہ وار کتابیں شائع ہورہی ہے، زیر تبصرہ کتاب ''محبت نبوی ﷺ'' بھی اس سلسلہ کی تیرہویں کڑی ہے، محبت نبوی ﷺ ایمان کا جزء ہے، ایمانی رشتے کا اثبات بھی اس سے وابستہ ہے، محبت نبوی ﷺ کے بغیر ایمان ادھوری ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ محبت نبوی کیا ہے؟ اس سے مراد کیا ہے؟ اس کا دائرہ کار اور حکم اور علامات کیا ہے؟ مؤلف نے ان تمام پہلوؤں کو اس مختصر کتابچے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

اسوہ حسنہ کی روشنی میں تفریح کا تصور

تالیف: ڈاکٹر محمود احمد غازی، ضخامت: ۴۷ صفحات ناشر: زوار اکیڈمی پبلی کیشنز کراچی

یہ کتابچہ ڈاکٹر محمود احمد غازی کی ایک تقریر ہے جو انہوں نے الہدیٰ، اسلام آباد میں خواتین کے سامنے کی تھی، اسے زوار اکیڈمی کے رفیق جناب آغا عبدالصمد منصور نے صفحہ قرطاس پر افادہ عام کی خاطر منتقل کیا، اور ماہنامہ تعمیر افکار میں شائع کیا اب زوار اکیڈمی نے اس اہم تقریر کی مزید تصحیح اور حوالوں کے اضافے کے بعد سلسلہ ''جواہرات سیرت'' کا ایک حصہ بنایا اور شائع کرنے کی سعادت حاصل کی یہ اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے جو سیر وتفریح کے پہلوؤں سے بحث کرتی اور سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں اس پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے، اللہ اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے اور زوار اکیڈمی کے اس مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔